بسم اللہ الرحمن الرحیم

رحیم الدین کمال I.A.S کی فن تقریر
پر یہ ایک مکمل اور مثالی کتاب ہے
اس کتاب میں قائد ملت رح کا تحریر
کردہ مقدمہ صفحہ ۷، ۸ دو صفحات
پر مشتمل شریک کتاب ہے
صفحہ ۷۸ پر نواب صاحب کی پرجوش
تقریر کا تذکرہ نواب محسن الملک کی
تقریر کے ضمن میں درج ہے
صفحہ 99 سے ۱۰۲ صفحات پر
لیفٹیننٹ بہادر یار جنگ رح، نواب صاحب کی سحر البیانی
پر سیر حاصل مضمون شریک کتاب ہے۔ نزیہ الحق

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اُردو شمارہ — (۷۲)

خطابیات

یعنی

فن تقریر (حصۂ دوم)

معہ مقدمہ

نواب بہادر یار جنگ بہادر

از

شیخ رحیم الدین کمال ظہیرآبادی

سنہ ۱۹۴۱ء

بار اول — مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن — قیمت ۱۲/

Mir Abid Ali

اس موضوع پر

دوسری کتاب

فن تقریر

اس موضوع سے متعلق خطابیات کے علاوہ ادارۂ ادبیات اُردوؔ کی مرتبہ پہلی کتاب کے مطالعہ کی بھی سفارش کی جاتی ہے جو چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اور جس میں تقریر کرنے کے طریقوں، مقرر کے اوصاف اور انداز گفتگو وغیرہ کو تصویروں کے ساتھ سمجھایا گیا ہے۔

صفحات	قیمت
۹۶	۸/

فہرست مضامین

سلسلہ نشان	مبادی تقریر	صفحات	سلسلہ نشان	اُردو کے مقررین	صفحات
۱	انتساب	۴	۱۴	سرسید احمد خاں	۷۲
۲	عرض حال	۵	۱۵	نواب محسن الملک	۷۸
۳	مقدمہ از نواب بہادر یار جنگ بہادر	۷	۱۶	ڈاکٹر نذیر احمد	۸۱
۴	تقریر کا ارتقاء	۹	۱۷	مولوی عزیز مرزا	۸۶
۵	اثر پذیری	۱۴	۱۸	مولانا محمد علی	۹۰
۶	مقرر کی قائدانہ خصوصیات	۲۱	۱۹	عطاء اللہ شاہ بخاری	۹۵
۷	مباحثہ	۲۶	۲۰	مولانا ابوالکلام آزاد	۹۷
۸	گروہی مباحث	۳۳	۲۱	نواب بہادر یار جنگ بہادر	۹۹
۹	نثری تقریر	۳۶	۲۲	انجمن	۱۰۳
۱۰	ضیافتی تقریر	۴۷	۲۳	صدر نشین	۱۰۵
۱۱	سپاس نامہ	۵۱	۲۴	مجالس خصوصی	۱۰۹
۱۲	وداعی تقریر	۵۶	۲۵	کتابیات (ماخذ)	۱۱۰
۱۳	تعزیتی تقریر	۶۱	۲۶	اشاریہ	۱۱۱

اس کتاب کا مقدمہ لکھنے کے لئے نواب بہادر یار جنگ بہادر سے زیادہ موزوں کوئی اور نہیں ہوسکتا تھا چنانچہ نواب صاحب نے اپنی مصروفیتوں کے باوجود مقدمہ تحریر فرمایا جس کے لئے نواب صاحب کا ممنون ہوں۔

ناسپاس گزاری ہوگی اگر میں اپنے اُن جواں سال اور جواں ہمت دوستوں کا شکریہ ادا نہ کروں جن کی امداد و تعاون کو اس کتاب کی ترتیب میں بہت کچھ دخل ہے۔ میرا ہر کام اُن کے ہی تعاون عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔

یہ کتاب طلبہ کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے اور زبان عام فہم و سلیس ہونے کے علاوہ میں نے اپنے ان تجربوں کو بھی قلمبند کیا ہے جو مجھے گزشتہ چند سالوں میں حاصل ہوئے ہیں۔ یہ تمام تجربے مبتدیوں کے لئے بہت زیادہ منفعت بخش ثابت ہوں گے۔

بعض عنوانوں کے لئے اتنا کافی مواد فراہم ہوگیا تھا کہ طلبہ کے علاوہ ان کی تربیت کرنے والوں کے لئے بھی مفید ثابت ہوتا لیکن طوالت کے خوف سے دانستہ اس سے احتراز کیا گیا۔ آئندہ کسی فرصت میں تربیت کرنے والوں کے استفادہ کی غرض سے ایک دوسری کتاب ترتیب دی جائے گی۔

میں نے یہ کتاب فنِ تقریر کے طالب علم کی حیثیت سے لکھی ہے مجھے امید ہے کہ ذی علم حضرات اپنے مشوروں سے استفادہ کرنے کا موقع دیں گے۔

جامعہ عثمانیہ
حیدرآباد دکن

رحیم الدین کمال ظہیرآبادی

اپریل ۱۹۴۱ء

مقدّمہ

مجھے اس بات کا ہمیشہ ملال رہا ہے کہ فن تقریر جیسے ضروری اور اجتماعی زندگی کے لئے لازمی فن پر اُردو زبان میں اچھی کتابیں نہیں ملتیں۔ کوئی شک نہیں کہ تقریر کا ملکہ قدرت کی عطا ہے۔ لیکن چند خاص ضابطوں پر عمل کرنے سے اس ملکہ کو ترقی دی جا سکتی اور تقریر میں زیادہ جاذبیت اور اثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً مبتدیوں کے لئے اس قسم کی ہدایات بہت مفید ثابت ہوتی ہیں۔ میں نے اُس وقت فنِ تقریر پر بعض کتابیں پڑھیں، جب میری تقریریں خاصی مقبول ہو چکی تھیں اور میرے اپنے تجربے نے اس فن کے چند اصول مرتب کر لئے تھے، پھر بھی مجھے ان کتابوں کے مطالعہ سے فائدہ پہنچا۔

قابلِ مبارکباد ہیں ہمارے نوجوان دوست رحیم الدین صاحب ظہیر آبادی، جنہوں نے اپنی انشاء پردازی اور تالیف کی ابتداء اس فنِ شریف کے مطالعہ اور تدوین سے کی ہے جب انھوں

نے مجھ سے پہلی مرتبہ ملاقات کی تو ان کی ذہانت، سنجیدگی اور معاملہ فہمی نے مجھے متاثر کیا تھا اور آج میں اپنے تاثر کو زیادہ پختہ محسوس کر رہا ہوں اور ان کے مستقبل کی درخشانی کا یقین رکھتا ہوں۔ ان کی یہ ابتدائی کوشش ہر طرح استحسان اور ہمت افزائی کی مستحق ہے اور وہ پہلا زینہ ہے جو ہمیشہ آنے والوں کو یا اپنے وسیع تجربہ کے بعد خود ان کو اس سے زیادہ مکمل اور اس سے زیادہ بسوط تالیف پر آمادہ کرے گا۔ سلیس اور عام فہم انداز میں اس کتاب میں تقریر کی تقریباً تمام اصناف سے بالاختصار بحث کی گئی اور وہ ساری ضروری باتیں جمع کردی ہیں۔ جو ایک مبتدی کے لئے ضروری ہوسکتی ہیں۔ اچھے مقرروں کے بغیر ایک قوم گونگی ہوتی ہے۔ اور ہم کو ابھی بہت سے اچھے مقرروں کی ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارا مستقبل جن مقرروں کو پیدا کرے گا۔ یہ کتاب ان کے لئے شمع راہ ثابت ہوگی۔

بہادر یار جنگ

مہدوی منزل
بیگم بازار

تقریر کا ارتقاء

روز بروز تقریر کے مفہوم اور منشا میں وسعت پیدا ہوتی جا رہی ہے۔ موجودہ زمانے میں عام طور پر تقریر سے مراد وہی بحث سمجھی جاتی ہے جس میں علمی اور سیاسی مسائل پر روشنی ڈالی جائے۔ ہر ترقی یافتہ زمانے میں تقریر کے لئے کوئی خاص موضوع قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ ہر عنوان پر تقریر کی جا سکتی ہے۔

جب تک مذہب کا چرچا تھا سیاسی مسائل میں عوام اس قدر گہری دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ اس لئے تقریر کے عنوانات بھی بالعموم مذہبی قرار پاتے تھے۔ ان بحثوں میں زیادہ سے زیادہ معاشرتی امور زیر بحث آجاتے تھے۔ لیکن سیاسی بیداری نے تقریر کے عنوان کی حدیں بہت وسیع کر دیں اور ہر مقرر کو سیاست کے میدان میں اپنے جوہر دکھانے کا موقع بہم پہنچایا۔ اس سیاسی بیداری کا چودھویں صدی عیسوی کے اواخر میں آغاز ہوا۔ اس کے آثار بہت جلد دُنیا کے ہر گوشے میں علمی و سیاسی مباحث کی صورت میں نمودار ہوئے۔

اہلِ روم و یونان بہت قدیم زمانے سے فنِ تقریر سے واقف تھے۔ پیدائشِ مسیح سے قبل بھی بڑے بڑے فلسفی پیدا ہوئے اور انھوں نے فن مباحثہ کی بنیادیں رکھیں۔ ان کے پیروں نے ان ہی بنیادوں پر تقریر کی عظیم الشان عمارتیں تعمیر کیں اِس فن پر اُن کی لکھی ہوئی کتابیں آج بھی قابلِ تقلید سمجھی جاتی ہیں۔

یونان و روما کی قدیم تاریخ میں بعض ایسی روایتیں محفوظ ہیں جن کے مطالعہ

سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ہر موقع پر قوم کو غیرت دلانے کے لئے اپنی شعلہ افشانیوں اور سحر بیانیوں سے کام لیا۔ اس دور میں نظم کو نثر پر ترجیح دی جاتی تھی کیونکہ اُن کا خیال تھا کہ انسان کے لطیف جذبات نظم کے ذریعہ زیادہ کامیابی سے اُکسائے جا سکتے ہیں۔ لیکن یونانی جمہوریت کے تخیل سے فن تقریر میں نمایاں ترقی ہوئی۔ چونکہ ان ریاستوں میں شخصی آزادی کا دور دورہ تھا اس لئے عوام کا حکومت سے بہت قریبی تعلق پیدا ہو گیا تھا اور اُس کے نظم و نسق سے متعلق مقررین اپنے آزاد خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ چنانچہ روما کے ایک مشہور فصیح کا قول ہے کہ "فصاحت آزادی کا بہترین ثمر ہے۔ یہ ماحول مقررین کے لئے بہت سازگار ثابت ہوا اور تقریر کی قدر و قیمت میں بھی بہت کچھ اضافہ ہوا۔ یہ فن اس دور میں بڑی محنت و مشقت سے حاصل کیا جاتا تھا۔ دیماستھینز، پرکلیز جیسی عظیم المرتبت ہستیوں نے اس فن میں ایسا کمال حاصل کیا کہ وہ بڑی بڑی جماعتوں کو اپنی تقریروں کے سحر سے اپنی مٹھی میں رکھتے تھے۔ جب اس کو روسیوں کی سرپرستی حاصل ہوئی تو سسرو اور کونٹیلین جیسے باکمال زباں آور پیدا ہوئے جنھوں نے اس فن پر بہت سی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔

عرب میں تقریر کا رواج بہت قدیم سے تھا۔ مختلف تقریبوں کے موقعوں پر قبیلوں کے خطیبوں کا آپس میں مقابلہ ہوتا تھا اور اُن خطیبوں کو وہ اپنے قبیلے کی زبان سمجھتے تھے۔ آنحضرت صلعم اور اُن کے خلفاء نے ہر اہم موقع پر تقریروں کے ذریعہ سے اپنے خیالات اور موقف کو لوگوں پر واضح کیا تھا اور یہ تقریریں اب تک محفوظ ہیں جو اسلامی تہذیب و سیاست کا منبع سمجھی جاتی ہیں۔ اسلام کی

تعلیمات سے ایران، ترکستان اور مصر میں بھی تقریروں کا رواج ہوا۔ ہر حکمراں جب کسی صوبے کے نظم و نسق کی باگ ہاتھ میں لیتا تو ایک عام تقریر کے ذریعہ اپنی حکمتِ عملی اور موقف کو واضح کر دیا کرتا تھا۔

ہندوستان میں دوسرے ملکوں کی طرح فنِ تقریر ابتدا، ہی سے رائج تھا۔ لیکن اس دور کی تقریروں سے دورِ حاضرہ میں تقریر کا جو مفہوم ہے پوری طرح سمجھ میں نہیں آتا۔ بدھ مت کی ترویج اور اشاعت کے سلسلے میں مبلغین ہندوستان کے طول و عرض میں پہنچ کر وہاں کی عام فہم زبانوں میں اپنے مذہبی خیالات کا پرچار کرتے تھے۔ راجہ اشوک نے اس فن میں بہت سی جدتیں پیدا کیں اور اسے ملک کے تقریباً ہر گوشے میں رواج دینے کی کوشش کی تھی

مسلمان فاتحوں نے ہندوستان میں فن تقریر پر کوئی خاص توجہ نہیں کی۔ البتہ یہاں کے حالات کے مطابق وعظ و نصیحت کے طریقوں کو خوب مقبولیت حاصل ہوئی اور یہ فن درجہ کمال تک پہنچایا گیا۔ اس ترقی کے باوجود اس کی ایک معین شکل ہوا کرتی تھی۔ ان میں اخلاقیات، مذہبیات پر خاص طور پر روشنی ڈالی جاتی تھی اور اس میں بھی دوسری مذہبی تقریروں کی طرح کبھی کبھار معاشرتی مسائل پر بھی روشنی ڈالی جاتی تھی لیکن وہ زندگی اور افادیت مفقود تھی جو بزرگانِ اسلام کی تقریروں میں نظر آتی ہیں۔ اِن تقریروں کا ایک تاریک پہلو ان کی طوالت اور بے ترتیبی بھی تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو وہ نفسیات سے ناواقف تھے اور دوسرے وقتِ واحد میں بہت زیادہ معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی جاتی تھی۔

ہندوستان پر جب انگریزوں کا تسلط ہوگیا تو اُن کی زبان بھی بولی اور سمجھی جانے لگی۔ سب سے پہلے اہلِ بنگال نے اس طرف توجہ کی اور دوسروں نے اُن کی پیروی کی۔ چونکہ تمام سرکاری کارروائیاں اسی زبان میں ہوتی تھیں۔ اس لئے ملازمت حاصل کرنے کے لئے اس زبان کا جاننا ضروری تھا۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کی غرض سے انگریزی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ اس کے بعد سے ہی ہندوستانیوں میں ذہنی انقلاب شروع ہوا۔ انگریزوں کی حکومت نے ہندوستان کی ترقی کے راستے میں خواہ کتنی ہی رکاوٹیں پیش کی ہوں لیکن عام سیاسی بیداری پیدا کرنے میں یہ رکاوٹیں بہت کامیاب ثابت ہوئیں۔ اسی احساس سے مختلف قومی، سماجی اور مذہبی انجمنیں وجود میں آئیں۔ بنگال کو اس قسم کی سرگرمیوں میں رہبری کا درجہ حاصل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بنگال آج بھی دوسرے صوبوں سے بہت آگے ہے۔

ان انجمنوں کی ایک طویل عرصے تک تمام کارروائیاں انگریزی زبان ہی میں ہوتی رہیں کیونکہ اس وقت تک کوئی اُردو اخبار ایسا جاری نہیں ہوا تھا جس سے ملک میں عام بیداری پیدا کی جاسکتی اور دوسرے یہ کہ حکمراں طبقے کو ملکی سرگرمیوں سے واقف کرانے کا بھی یہی ایک راست ذریعہ تھا۔ اس زمانے میں ان سیاسی سرگرمیوں کے دوش بدوش مذہبی تحریکیں بھی قوت حاصل کرتی گئیں۔ لیکن بہت جلد ملک کے یہ تمام منتشر اجزاء شیرازہ بند کئے گئے اور انڈین نیشنل کانگریس کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ اس انجمن کا مقصد ملک میں سیاسی بیداری پیدا کرنا تھا اور اس کے پہلے اجلاس میں جو بمبئی میں منعقد ہوا تھا ملک کے مشاہیر نے حصہ لیا اور تقریریں کیں جن کے اثرات بہت جلد تمام ملک میں پھیل گئے۔

لالہ بھگوان داس (ڈیرہ اسمٰعیل خاں) نے پہلی مرتبہ اُردو میں تقریر کی کیونکہ یہی ایک زبان ہے جو ہندوستان کی قومی زبان کہلائی جاسکتی ہے اور یہاں اکثریت اس زبان کو سمجھتی اور بولتی ہے۔ ان کے بعد دوسروں نے تقریروں کو عام فہم اور زیادہ موثر بنانے کے خیال سے ان کی پیروی کی۔ لالہ چیت رائے دوسرے مقرر ہیں جنھوں نے اُردو کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ اُن کو اس عام فہم زبان میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے میں غیر معمولی کامیابی ہوئی اُن کی تقریروں میں زبردست مقناطیسی اثر اور دل کشی تھی جس کی وجہ سے وہ سرسید جیسے بااثر قائد کی بھی مخالفت کرنے میں اکثر کامیاب ہوجاتے تھے۔ سرسید اور ان کی جماعت کو کانگریس والوں سے جو اختلاف تھا اس سے تقریر کے لئے ایک وسیع میدان مل گیا۔ چنانچہ آج جو تقریروں کی گرما گرمی ہے وہ دراصل ان بزرگوں ہی کی محنتوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

ے سرسید کے لکچرز مقالہ از سید رشید الحسن صاحب ایم۔ اے۔ بحوالہ تاریخ کانگریس۔

اثر پذیری

مقرر کو اعلیٰ درجہ پر پہنچانے میں دو قسم کی خصوصیتیں مدد دیتی ہیں۔ اُن میں سے بعض تو داخلی ہیں جن کا تعلق مقرر کے نفس سے ہوتا ہے اور بعض خارجی جن کے التزام سے تقریر میں دلچسپی اور اثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔

خارجی خصوصیتوں میں مشاہدہ سب سے اہم ہے اگر اس کو تقریر کا سنگِ بنیاد کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ جب تک مقرر کی قوت مشاہدہ قوی نہ ہو اسے سامعین کے جذبات کو اُکسانے اور حقائق کو محسوس طریقے پر بیان کرنے میں کامیابی نہیں ہوتی۔ یوں تو ہر شخص عجائباتِ قدرت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ لیکن بہت کم لوگوں میں اُس چیز کی روح حلول کرتی ہے جسے وہ دیکھتے ہیں۔ یہ قوت ان لوگوں میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہے جو دردمند دل کے مالک ہوتے ہیں اور دوسروں کی مصیبت پر بھی غم کھاتے ہیں۔

مشاہدے کے ساتھ غور و فکر بھی ضروری ہے۔ ان دونوں قوتوں کی بدولت ہی انسان میں اپج کی قوت پیدا ہوتی ہے اور صرف اپج ہی سے مقرر اپنی انفرادیت قائم کر سکتا ہے۔ ایسے ہی مقرروں کو پہلی صف میں جگہ دی جاتی ہے جن میں انفرادیت ہوتی ہے۔ غور و فکر کے علاوہ مطالعہ بھی ایک لازمی عنصر ہے۔ انسان صرف مشاہدہ کرتا رہے اور مطالعہ کی اہمیت کو نظر انداز کر دے تو اس سے اس کے اپنے تاثرات کو بیان کرنے کی صلاحیت سلب ہو جائیگی

خود مشاہدہ بھی مطالعہ ہی کی وجہ سے ترقی پاتا ہے اس سے خیالات میں استحکام اور بیان میں زور پیدا ہوتا ہے۔

اگر کوئی شخص ہر علم کا تفصیلی مطالعہ کرنا چاہے تو عمر خضر بھی ناکافی ہوگی۔ اس لئے ہر علم کے متعلق تھوڑی بہت معلومات کافی ہیں۔ تقریر میں ضرورت سے زیادہ معلومات بہم پہنچانے سے دلچسپی باقی نہیں رہتی۔ یہ ان لوگوں کا کام ہے جنھیں تقریر میں غیر معمولی ملکہ حاصل ہے اور نہایت ہی سلجھے ہوئے انداز میں ان تمام معلومات کو بیان بھی کرسکیں۔

تاریخ و ادب کے ساتھ فلسفہ اور منطق کی چاشنی تقریر میں اثر اور دلچسپی پیدا کرتی ہے اور مقرر اپنا مافی الضمیر مناسب و مرتب انداز میں ادا کرسکتا ہے۔ ایسے مقرر کی دلیلیں بھی بہت مؤثر ہوتی ہیں جن کے مطالعہ میں فلسفہ اور منطق کی کتابیں رہتی ہیں۔ بعض وہ مقرر جن کو اُن علوم سے تھوڑی بہت واقفیت ہوتی ہے اُن عالموں سے زیادہ مقبولیت حاصل کرلیتے ہیں جن کی معلومات بہت وسیع ہوتی ہے۔

مقرر کو ادب سے خاص لگاؤ رکھنا چاہئے۔ اچھے شاعروں اور ادیبوں کی کتابیں پڑھنے سے زبان میں سلاست و شیرینی پیدا ہوتی اور خیالات خود بخود الفاظ کا جامہ اور اظہار کا قالب پیدا کرلیتے ہیں۔ زبان کی سلاست و روانی سے سامعین پر خاصہ اثر پڑتا ہے۔ معمولی سا معمولی خیال بھی اگر جچے تُلے الفاظ میں بیان کیا جائے تو اس سے مقناطیسی اثر پیدا ہوتا ہے۔

مقرر کو اس قابل ہونا چاہئے کہ وہ کسی موضوع پر بھی فی البدیہہ تقریر کرسکے

لیکن مبتدیوں کے لئے اس درجہ پر پہنچنے تک اور بہت سی منزلیں طے کرنی ضروری ہیں۔ ابتدا میں بعض لوگ مواد فراہم کر کے لکھ لیتے ہیں اور اُسی کو پڑھتے ہیں جب اس طرح کچھ مشق بہم پہنچتی ہے تو لکھی ہوئی تقریر حفظ کر کے سناتے ہیں آخری منزل وہ ہے جس میں تقریر شروع کرنے سے پہلے ذہنی خاکہ مرتب کر لیا جاتا ہے یہ خاکہ مکمل اور منطقی ہونا چاہئے اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ پورے موضوع پر حاوی ہو۔ خاکے کی تقسیم چھوٹی بڑی سرخیوں کے تحت کی جائے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ موضوع سے متعلق نئے اور بہترین خیالات، خاکہ کی تکمیل کے بعد ذہن میں آتے ہیں۔ اس لئے پہلے ہی سے اُن کے لئے رعایت رکھنی چاہئے۔ خاکے میں خیالات اور الفاظ کی رنگ آمیزی کی جائے۔ معلوماتی تقریروں کی طرح ابتدائی منزل میں بہت زیادہ مواد اور معلومات کی ضرورت نہیں ہم نے بعض نوجوان مقرروں کی تقریریں سُنی ہیں جو معلومات آفریں تو تھیں لیکن از حد خشک تھیں البتہ علمی تقریریں جو صرف معلومات بہم پہنچانے کے لئے کی جائیں اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں۔

تقریر کے لئے مواد جمع کرنے کے دو ذرائع ہیں۔ ایک تو خود مقرر کے غور و فکر سے، دوسرے مطالعہ اور بحث و مباحثے کے ذریعہ

پہلا ذریعہ بہت اہم ہے۔ اچھے مقررین وقت سے پہلے ہی موضوع پر کافی غور و فکر کرتے ہیں۔ جیسے جیسے اُن کے دماغ میں خیالات آتے ہیں وہ اپنی یادداشت پر اُن کو کسی نہ کسی سرخی کے تحت لکھ لیتے ہیں اور مطالعہ کے ذریعہ اس میں مزید تقویت پہنچاتے ہیں۔

تبادلۂ خیال کرنے سے بھی معلومات میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن اس مقصد کے لئے فریق ثانی کے انتخاب میں بہت احتیاط کرنی چاہئے تاکہ اس سے بہت کچھ فائدہ حاصل کیا جا سکے۔

مقرر کو ان تمام امور کے علاوہ طرز بیان کو بھی دلچسپ بنانے کی کوشش کرنی چاہئے، حرکات و سکنات سے مقرر کا بہت کچھ مفہوم ادا ہوتا ہے۔ ہر حرکت برمحل ہو۔ ورنہ خواہ مخواہ ہاتھ، پاؤں، ناک اور آنکھ کی حرکتوں سے مقرر کا طرز بیان مضحکہ خیز تماشا بن جاتا ہے اور تقریر کی تمام خوبیوں کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکتا۔

آواز بھی مقرر کا ایک بڑا حربہ ہے۔ "آواز بلند اور صاف ہو۔" اس سے سامعین پر خاص اثر پڑتا ہے۔ آواز خیالات کا پوری طرح ساتھ دے اور اس میں یکسانیت بھی برقرار رہے اور بلندی و پستی میں بھی وہی اثر ہو آواز اتنی صاف بلند اور گرج دار ہو کہ بڑے سے بڑا مجمع بھی آسانی سے سُن سکے۔

خیالات کیسے ہی ارفع و اعلیٰ ہوں اگر آواز گرج دار نہیں تو مقرر ہرگز اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہٹلر کی مقبولیت کا بڑا راز یہ ہے کہ اس کی تقریر ایک کڑکتی ہوئی بجلی، ایک گرجتا ہوا بادل ہے۔ اسی خوبی کی وجہ سے ساری دُنیا نہایت ہی بے چینی سے اس کی تقریر کا انتظار کرتی ہے کہ کیا نیا شگوفہ کھلاتی ہے۔ ہٹلر کی آواز کے علاوہ اس کی تقریر کا ہر لفظ معنی خیز ہوتا ہے۔

مقرر کو وقت کا خاص طور پر لحاظ رکھنا چاہئے۔ اچھے مقرر کے متعلق عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وقت اس کا غلام ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جتنے

مختصر سے وقت میں وہ چاہے تقریر ختم کردے اور سامعین یہ اندازہ نہ لگا سکیں کہ اسے اور بہت کچھ کہنا تھا اور اس کے برخلاف اگر تقریر کے اختتام پر اس سے یہ کہا جائے کہ وہ اپنی تقریر جاری رکھے تو وہ اس ترکیب سے اپنی تقریر کو پھیلائے کہ سامعین کبھی یہ باور نہ کرسکیں کہ تقریر کو خواہ مخواہ ہی طوالت دی گئی ہے۔ بعض مبتدی وقت کا لحاظ کئے بغیر صرف ایک سرخی کی وضاحت ہی میں اپنا پورا وقت صرف کردیتے ہیں اور تقریر پوری طرح ختم کرنے نہیں پاتے۔ ایسے مقرروں کو مقابلوں میں ہمیشہ ناکامی ہوتی ہے۔

ان خارجی اُمور کے علاوہ بعض داخلی تاثرات بھی ہوتے ہیں جن کی مدد سے انسان کامیاب مقرر بن سکتا ہے۔ ان داخلی امور کا تمام تر انحصار انسان کی نیک نفسی اور روشن ضمیری پر ہوتا ہے۔ ایسے ہی انسانوں میں جرأت اور دلیری پیدا ہوتی ہے۔ جن لوگوں کی قوتِ ارادی اور عزم کی طاقت قوی ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑا دشمن بھی اُن کے آگے سرِنیاز خم کردیتا ہے۔

خود اعتمادی مقرر کا سب سے بڑا ہتھیار ہے جس کے بغیر نہ تو وہ مجمع کے سامنے آسکتا ہے اور نہ اُسے اپنے مافی الضمیر کے بیان کرنے میں کامیابی ہوتی ہے خود اعتمادی مشق اور تجربے سے پیدا ہوتی ہے۔ بعض ایسے لوگوں کی بھی مثالیں ملتی ہیں جو ابتدائی دور میں مجمع کے آگے کھڑے ہوتے ہی بے ہوش ہوجاتے تھے۔ لیکن مسلسل مشق سے بہت ہی بے باک اور نڈر مقرر بن گئے ہیں۔ خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے مقرر کو یہ خیال اچھی طرح دل نشین کرلینا چاہئے کہ وہ کسی مدرسہ میں طالب علموں کو درس دے رہا ہے اور اس کے سامعین طالب علم ہیں جو اس سے اکتسابِ فیض کے لئے جمع ہوئے ہیں۔

مقرر کا کردار اعلیٰ ہونا چاہئے۔ اخلاق ہی انسان کی وہ مقناطیسی قوت ہے جو دلوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ایسا مقرر اپنے حرکات و سکنات اور آواز میں بہت نڈر اور بے خوف ہوجاتا ہے۔ چونکہ ان مقرروں کے دل تمام کمینہ جذبات سے پاک ہوتے ہیں اور اُن کے بیان میں خلوص و محبت بھی ہوتی ہے۔ اس لئے سامعین ہمہ تن گوش ہوجاتے ہیں۔

مقرر کو چاہئے کہ اپنے آپ کو سامعین کا ہمدرد ثابت کرے۔ اس مقصد کے لئے اُسے اُن کے رجحانات و جذبات کا بغور مطالعہ کرنا چاہئے۔ مقرر علانیہ مخالفت کرکے اپنی تقریر زیادہ دیر تک جاری نہیں رکھ سکتا اس لئے اسے سامعین کی ذہنیت نفسیات اور رنج و غم کے جذبات سے پوری طرح آگاہ ہونا چاہئے اور وہ اُن کے احساسات کے ساتھ کسی عنوان بھی لاپروائی نہیں برت سکتا۔ اس لئے مقرر کو اس راہ میں بہت دانشمندی اور ہوشیاری سے کام لینا پڑتا ہے۔ اُسے مجمع میں جذبات کی انفرادی اور اجتماعی حیثیتوں کا صحیح اندازہ ہونا چاہئے۔ یہ تمام خوبیاں ان مقرروں میں بدرجہ اتم موجود ہوتی ہیں جن کو زندگی کے ہر شعبے کی علمی معلومات حاصل ہوں۔ مخالف جماعت کے آگے بھی اس انداز میں تقریر کرے کہ ابتداء میں سامعین بے اختیار یہ سمجھنے پر مجبور ہوجائیں کہ وہ اُن کا ہم خیال ہے۔ رفتہ رفتہ اُن کے خیالات کو بدلنے کے لئے مختلف حربے استعمال کرے حتیٰ کہ ان کی مخالفت بالکل ختم ہوجائے۔

سامعین کے لحاظ سے دلچسپی کے عناصر اور اُن کے تناسب میں بھی کمی اور زیادتی کی جانی چاہئے۔ ایک خشک طبیعت مقرر بہت دیر تک تقریر جاری نہیں رکھ سکتا اس لئے کبھی کبھی مزاح کی چاشنی بھی اس میں شریک ہوتی رہے تو مناسب ہے لیکن

اس میں حدِ اعتدال سے تجاوز نہ کیا جائے۔

تقریر کو مؤثر بنانے میں مقرر کی وجاہتِ جسمانی بھی بہت بڑی حد تک مدد دیتی ہے۔ جن مقرروں کی ذات میں بادشاہوں کا سا وقار اور شہنشاہوں کا سا جلال ہوتا ہے۔ وہ ملک و قوم کی کامیابی سے قیادت کر سکتے ہیں۔

مقرر کی قائدانہ خصوصیات

قیادت اور تقریر میں چولی دامن کا رشتہ ہے دُنیا کے مشہور قائدین کی زندگیوں کے حالات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ حقیقت سمجھ میں آتی ہے کہ اُن میں سے اکثروں نے اپنی قوت بیان ہی کی بدولت قیادت کا مرتبہ حاصل کیا تھا

قائدین کی تقریروں کا دقت نظری سے مطالعہ کرنے کے بعد ایک خاص انفرادیت کا پتہ چلتا ہے جو عام تقریروں میں نہیں ہوتی۔ اس انفرادیت کا راز دراصل اُن کی قوت بیان اور نفسیاتی معلومات میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ ایسی تقریریں محفوظ ہیں جن میں مواد تو بہت ہی کم ہے لیکن ان کا ہر جملہ نفسیات عامہ کا مرقع ہے۔ اس خصوصیت کی بدولت مقررین بڑی بڑی جماعتوں کو اپنے قابو میں رکھتے ہیں اور اُن سے بعض ایسے کام لیتے ہیں کہ اُن میں کا ہر فرد اپنی انفرادی حیثیت سے اُن کا خیال بھی نہیں کر سکتا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تقریر کا اتنا زبردست اثر مجمع کے دل و دماغ پر طاری ہو جاتا ہے کہ اُن کی قوت فیصلہ سلب ہو جاتی ہے اور وہ بالکل مقرر کے اشاروں پر کام کرنے لگتے ہیں۔ یہ حالت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کہ افراد اکٹھے ہو کر کسی واحد مقصد کے لئے جد و جہد کرتے ہیں۔ اس اجتماع کی مثال ان ندیوں کی سی ہے جو مختلف سمتوں سے آکر ایک بڑے دریا میں مل جاتی ہیں اور اُن کی انفرادیت باقی نہیں رہتی۔ یہی حال مجمع کے افراد کا بھی ہوتا ہے کہ جب وہ مجمع کی شکل اختیار کرتے ہیں تو ان کے حرکات و سکنات اجتماعی احساس کے تابع

ہوجاتے ہیں۔ اس فضا کے پیدا کرنے کے لئے ایسی تقریر کی جانی چاہیئے کہ افراد اس کیمیائی مرکب کے اجزاء کی طرح جن میں تعامل کے بعد ان کی ذاتی خصوصیتیں باقی نہیں رہتیں اپنی انفرادی ہستی کو اجتماعیت میں ضم کردیں۔

اس اجتماعی احساس کے پیدا کرنے میں چند تاثرات کارفرما ہوتے ہیں جن میں سے بعض کا تعلق مقرر کی ذات سے ہوتا ہے اور بعض مجمع کے افراد سے متعلق ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے تاثرات کا علم بھی مقرر کے لئے ضروری ہے ورنہ وہ کسی تحریک کو قوت سے عمل میں نہیں لاسکتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جذبۂ محاکات واثر پذیری اجتماعی زندگی کی بنیادیں ہیں جو اجتماعی احساس کے ہاتھوں رکھی جاتی ہیں۔ بقول جیمس "انسان ایک بے بس اور تقلید کرنے والا حیوان ہے" اور اس کی ساری تعلیم پذیری اور ترقی تمدن کا دارومدار اسی ایک خصوصیت پر ہے جسے رشک، تفوق اور مسابقت کی قوتوں سے تقویت پہنچتی ہے[عہ]۔ تقلید کا اثر خیالات کے علاوہ انسان کے جذبات پر ہوا کرتا ہے۔ بعض اوقات جب ایک شخص کسی چیز سے نفرت کا اظہار کرتا ہے تو اس کی تقلید میں اکثر لوگ بغیر خاص وجہ کے اُس سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایک فرد کے جذبات سارے مجمع پر اثر انداز ہوسکتے ہیں موجودہ دنیا میں پروپگنڈا کو اسی وجہ سے بہت زیادہ اہمیت دیجاتی ہے۔

اگر اجتماعی زندگی کی یہ حقیقت مقرر کے پیش نظر رہے تو وہ اپنی تقریر سے ایسا ماحول پیدا کرسکتا ہے کہ ہر فرد تقلید پر مجبور ہوجاتا ہے۔ اس مقصد کے لئے ہمیشہ اس امر پر زور دیا جائے کہ اشتراک عمل اور اتفاق خیال ہی دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا حربہ ہیں اور اس غرض سے جو بھی پابندیاں کسی جماعت کے اراکین پر عائد کیجائیں

عہ فلسفہ اجتماعیت

وہ اُن کی بھلائی و خیر خواہی پر مبنی ہوں گی، اور اگر ہر شخص کو اس بات کی آزادی دی جائے کہ وہ حسب منشا، طریق کار اختیار کرے تو ظاہر ہے کہ اس سے جماعت میں انتشار پیدا ہو جائے گا اور کسی مقصد میں کامیابی نہیں ہوگی۔ بعض ایسی جماعتوں میں بھی جو خالص جمہوری اُصولوں پر قائم کی جاتی ہیں "ضبط جماعت" کی پابندی اراکین پر لازمی کر دی جاتی ہے اس لئے اراکین شخصی اختلاف کے باوجود جماعت کے طریقۂ کار میں پورے معاون و مددگار ہوتے ہیں۔ جماعت میں بہترین نظم و ضبط وہی لوگ قائم رکھ سکتے ہیں جن کی ذات میں قوتِ تسخیر ہوتی ہے اور انہیں دوسروں کی قیادت میں کام کرنے کا بھی تجربہ حاصل ہوتا ہے۔

مقرر کی قوتِ تسخیر سے مراد وہ کیفیت اور رعب ہے جو دوسروں کے دل و دماغ پر طاری ہو جاتا ہے۔ اگر دُنیا میں کسی کو غلبہ حاصل ہوا تو اس کی محرکات میں اس ذاتی سطوت کو امتیازی درجہ حاصل رہا ہے۔ انسان کی قوت تسخیر یا سطوت ایک ایسی خصوصیت ہے جو قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتی ہے لیکن اس میں مصنوعی ذرائع سے بھی تقویت پہنچائی جا سکتی ہے۔

دُنیا کے مشہور قائدین بچپن ہی سے سطوت ذاتی کے حامل تھے اور اُن کی قوت تسخیر کا یہ عالم تھا کہ ہم سن بچے اُن کی رائے سے اختلاف کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے تھے جب ان بچوں نے ترقی کی تو اپنے آپ کو نپولین، نادر شاہ اور مصطفیٰ کمال کے ناموں سے روشناس کروایا۔

مقرر کا سب سے بڑا حربہ اس کی قوت ارادی ہے۔ قوت ارادی ایسی ناقابل تسخیر ہو کہ بڑی سی بڑی مشکلات بھی اس کا ارادہ متزلزل نہ کر سکیں ہر مقرر قیادت

کی باگ ہاتھ میں لینے سے پہلے اپنی قوت ارادی کا جائزہ لے اور جن کی یہ قوت کمزور وضعیف ہوتی ہے۔ انہیں قیادت کی ذمہ داریوں کو ہرگز قبول نہ کرنا چاہئے جو شخص قوت ارادی کا مالک ہوتا ہے اس سے سطوت ذاتی کا بھی اظہار ہوتا ہے

مقرر کی ان خصوصیتوں کے ساتھ اس کی علمیت کو بھی اثر پذیری میں بہت زیادہ دخل ہے اور ایسے ہی لوگوں کی قیادت ہر طبقہ کے لئے قابل تقلید ہوتی ہے قوت تسخیر کے استعمال کے لئے محل اور موقع شناسی کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ صحیح محل استعمال کے لئے مقرر کو انسان کی نفسیات کا علم ہونا چاہئے۔ لیکن یہ علم نفسیات کی ضخیم کتابوں کے مطالعے سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے مشاہدے سے استفادہ کرنا ضروری ہے اور وسعت نظر ایک لازمی شرط ہے۔

تقریر کی اہم خصوصیت اس کا مدعیانہ لہجہ ہے جب کسی خیال یا مقصد کی اشاعت منظور ہوتی ہے تو اس کو اس طرح مبالغہ کا رنگ چڑھا کر خطیبانہ اور موثر انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ جماعت صرف مقرر کے بیان پر اعتماد کر لیتی ہے۔ یہ ادعا و تحکم، شک، تذبذب اور فلسفیانہ دلیلوں سے یکسر خالی ہوتا ہے۔ اس میں مزید تقویت پہنچانے کے لئے ایک دوسرا حربہ استعمال کیا جاتا ہے جس کو تکرار کہتے ہیں۔ اس ضمن میں نپولین کا ایک مقولہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ "خطابیات کے اصلاح خانہ میں سب سے کارگر حربہ تکرار ہے" اشتہار بازی اسی اصول پر مبنی ہے۔

مقرر کا لباس بھی قوت تسخیر میں تقویت پہنچاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قائدین خاص قسم کا لباس بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔ وکلاء گون میں اپنے سادہ لباس کی نسبت زیادہ صاحب اثر دکھائی دیتے ہیں۔

قوت تسخیر کا اثر براہ راست زیادہ ڈالا جا سکتا ہے۔ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر قائدین تحریر کی نسبت تقریر کو اظہار خیال کا موثر ذریعہ سمجھتے ہیں اور ان لوگوں سے جن پر اپنا اثر ڈالنا چاہتے ہیں راست تعلقات قائم رکھتے ہیں۔

ان کے علاوہ بعض خارجی موثرات بھی ہیں جن سے قائد کی قوت تسخیر میں زوال شروع ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان سے محفوظ رہنا ضروری ہے ہر ایسی چیز جس سے قائد اور مقتدی کے درمیان امتیاز کم ہو نقصان دہ ہوتی ہے اور بدنامی و بے عزتی سے بھی سطوت کو صدمہ پہنچتا ہے اور بے عزتی و بدنامی کے ساتھ جب مخالف پروپگنڈا شروع ہوتا ہے تو حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ ایک مشکل کام بن جاتا ہے۔ اکثر قائدین ہمیشہ ایسے کاموں سے محترز رہتے ہیں جن میں ناکامی کا اندیشہ ہوتا ہے اور اگر ناکامی ہوتی بھی ہے تو اسے دوسروں سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ لوگ اُن کے متعلق کسی قسم کا مخالف خیال نہ قائم کر سکیں۔ تنقید اور نکتہ چینی میں جب بہت زیادہ سختی ہوتی ہے تب بھی قیادت کو نقصان پہنچتا ہے اس لئے بعض لوگ بظاہر تو مساوات کے بہت زیادہ حامی دکھائی دیتے ہیں لیکن وہ اپنی خانگی زندگی میں کسی کی آزادیٔ رائے کو گوارہ نہیں کرتے۔

قیادت کے استقلال کا تمام تر انحصار قائدین کی صداقت خدمت گزاری پر ہوتا ہے اور ایسے زعماء ہی قائد کہلانے کے صحیح معنے میں مستحق ہیں جن کی زندگیاں شخصی خود غرضیوں سے یکسر پاک ہوں ان بے غرض خدمت گزاروں کو نہ تو اپنی قیادت کی فکر دامنگیر ہوتی ہے اور نہ اس بات کا اندیشہ کہ وہ ناکامی کے باعث قوم کی نظروں میں ذلیل ہو جائیں گے۔ اس لئے وہ اپنے ضمیر کے اطمینان ہی کو خدمتگزاری کا صلہ تصور کرتے ہیں

مباحثہ

ہر انسان کو خواہ وہ کوئی سا پیشہ اختیار کرے اپنے مافی الضمیر کے ظاہر کرنے کی قدرت حاصل ہونی چاہئے جن لوگوں کو زبان پر قدرت حاصل ہوتی ہے وہ تقریر کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں اور جو لوگ قلم کے دھنی ہوتے ہیں وہ اپنے خیالات کو قبل از وقت مرتب کر لیتے ہیں اور کبھی عنوان کی نوعیت کے لحاظ سے بھی تقریریں قبل از وقت مرتب کر لی جاتی ہیں۔ خاص کر ان تقریروں کو جو کسی دقیق اور تحقیق طلب عنوان پر کی جائیں۔ قبل از قبل مرتب کر لینے سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کی اشاعت سے عوام کی ایک کثیر تعداد فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ تقریر خواہ کسی نوعیت کی ہو اس کے لئے جب تک بچپن ہی سے مشق نہ کی جائے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اسی مقصد سے مدرسوں اور شہروں میں بحث و مباحثہ کی انجمنیں قائم کی جاتی ہیں تاکہ مبتدیوں کے لئے حوصلہ افزا پیدا ہو اور اس طرح اُن کی معقول تربیت بھی ہوتی رہے۔

مباحثے کی دو منزلیں ہوتی ہیں (۱) تربیتی (۲) علمی۔ ان دونوں میں یہ فرق ہے کہ علمی مباحثوں میں اختلافی علمی مسائل پر بحث کی جاتی ہے جن کو عام طور پر مناظرہ کہتے ہیں۔ ان بادشاہوں اور مسلمان خلفاء کے دور میں مناظروں کو بہت ترقی ہوئی جو فلسفہ کے قدر دان تھے۔ خاص کر خلافتِ عباسیہ کا عہد اس قبیل کی بحثوں کے لئے بہت مشہور رہا ہے۔

تربیتی مباحثوں میں وہ تقریریں شامل ہیں جو مشق کی خاطر کی جاتی ہیں۔ ان مباحثوں کے لئے قبل از وقت کوئی ایک عنوان مقرر کر دیا جاتا ہے اور چند طالب علم عنوان کی تائید میں اور چند مخالفت میں تقریریں کرتے ہیں۔ مباحثے کے آغاز کرنے والے کو محرک کہتے ہیں۔

تقریر اور مباحثے میں نمایاں فرق یہ ہے کہ تقریر میں کوئی ایک شخص کسی خاص موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے برخلاف مباحثے میں محرک اور مخالف ہر ایک اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ عنوان کو غلط ثابت کریں یا اُس کی صداقت سب سے منوالیں۔

جب محرک مباحثے کا آغاز کرتا ہے تو وہ موضوع کے روشن پہلو کو مختلف دلیلوں سے ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور مخالفت میں تقریر کرنے والا موضوع کے تاریک پہلو کو اُجاگر کرنے میں اپنا پورا زورِ بیان صرف کرتا ہے اس سے موضوع کے دونوں پہلوؤں پر کافی روشنی ڈالی جاسکتی ہے اور اس طرح طلبہ کے دماغوں میں توازن اور نظر میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

تربیتی مباحثے میں زیادہ علمی رنگ پیدا کرنے کی کوشش عبث ہے۔ مواد مطالعہ سے زیادہ غور و فکر سے حاصل کرنا چاہئے۔ بحث کے ذہنی خاکے کو کتابی معلومات کے ذریعہ پورا کرنے سے زیادہ اثر اور دلچسپی پیدا نہیں کی جاسکتی۔ بلکہ اس میں اپنے مشاہدے سے مدد لینی چاہئے۔ دلیلوں میں ایسی باتیں ہی پیش کی جائیں جو روزمرہ زندگی سے قریبی تعلق رکھنے والی اور مؤثر ہوں۔

مباحثے میں وقت پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے کیونکہ ایک مقررہ وقت میں

کئی مقرروں کو موقع دیا جاتا ہے۔ بعض ناتجربہ کار طلبہ سابقتی مباحثوں میں محض اس لئے ناکام رہتے ہیں کہ وہ کسی ایک بات کی وضاحت میں پورا وقت صرف کردیتے ہیں اور انھیں دوسری دلیلوں کے بیان کرنے کا موقع نہیں ملتا۔

مباحثے میں مقررین کو بالعموم تین قسم کے نشانات دئے جاتے ہیں:۔
(۱) مواد (۲) زبان اور (۳) طرز بیان، اگر مقررین ان تینوں امور کو پیش نظر نہ رکھیں اور اُن کے محصلہ نشانات میں توازن پیدا نہ ہو تو انھیں کسی صورت کامیابی نہیں ہوسکتی۔ ہر طالب علم کو اس امر کی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ مقررہ وقت میں تمام مواد پیش کردے اور مواد پیش کرتے وقت ترتیب و تسلسل کا بھی خیال رکھے بعض ایسے مقررین بھی دیکھے گئے ہیں جو ایک ہی سرخی کے تحت جو باتیں بیان کرنی چاہئیں دو مختلف موقعوں پر بیان کرتے ہیں۔ اس طرح کی بے ترتیبی سامعین پر گراں گزرتی ہے۔ اس لئے طالب علموں کو چاہئے کہ وہ مباحثے کے عنوان کو چند سرخیوں کے تحت تقسیم کرلیں اور اُن سرخیوں میں اتنی گنجائش رکھیں کہ اگر نئے اور بہترین خیالات تقریر کے وقت ذہن میں آجائیں تو انھیں اُسی ترتیب سے جگہ دی جاسکے۔

ہمیشہ نرم و آہستہ آواز سے تقریر شروع کریں اور رفتہ رفتہ آواز بلند کی جائے لیکن مباحثوں میں مقرر کی آواز نہ تو اتنی بلند ہو کہ عمارت گونجنے لگے اور نہ اس قدر پست کہ پہلی صف میں بیٹھنے والے بھی نہ سُن سکیں۔ خطیبانہ انداز بیان ہر تقریر میں ضروری ہے لیکن مباحثہ میں اس کا حدِ اعتدال سے گزر جانا قابلِ اعتراض سمجھا جاتا ہے۔

طلبہ کو زبان اور تلفظ کی صحت پر خاص توجہ دینی چاہئے۔ جن طلبہ کی معلومات دلچسپ، نئی اور مؤثر ہونے کے باوجود تلفظ درست نہیں ہوتا وہ انعام سے محروم

رہ جاتے ہیں۔ اس لئے جب کبھی دوست احباب اور بزرگوں سے گفتگو کریں تو صحت زبان اور تلفظ کو ضرور پیش نظر رکھیں۔ روزمرہ اگر اس نقطۂ نظر سے گفتگو کی جائے تو اس سے بہت کچھ اصلاح ہو سکتی ہے۔

ہر لفظ زبان اور لب کی پوری حرکت سے صاف صاف اور علیحدہ ادا کیا جائے تاکہ ایک دوسرے کے ساتھ نہ مل جائیں۔ ٹھیر ٹھیر کر تقریر کریں اور ایسا کبھی نہ ہو کہ لفظ کے پوری طرح ادا ہونے سے پہلے ہی لب بند ہو جائیں۔

مباحثہ میں مقرر کی رفتار نہ تو ضرورت سے زیادہ تیز ہو کہ سامعین اس کی تقریر کو اچھی طرح نہ سمجھ سکیں اور نہ اس قدر سست کہ اُلجھن پیدا ہو۔ روانی صرف مشق سے پیدا ہوتی ہے۔ بعض مقررین ایک ہی انداز سے تقریر کو جاری رکھتے ہیں اور آواز کے اُتار چڑھاؤ کا کوئی لحاظ نہیں کرتے یہ بات بھی ان کے نشانات کو متاثر کرتی ہے۔

ان تمام اُمور کے علاوہ طالب علموں کے طرز بیان پر خاص طور پر ممتحنوں کی نظریں رہتی ہیں۔ اکثر مدرسوں میں انجمن مباحثہ قائم ہونے کے باوجود اساتذہ کی عدم توجہی کے باعث طلبہ کی مناسب تربیت نہیں ہوتی اس لئے ان کی لغزشوں سے مدرسے کی بدنامی ہوتی ہے۔ بعض ایسے طالب علم دیکھے گئے ہیں جو میز پر جھک کر ہاتھ یا پاؤں کو نہایت مضحکہ خیز انداز میں گھمانے یا ناخن کو اپنے دانتوں سے کترنے کے عادی تھے یا ایک ہی طرف رُخ کر کے تقریر کرتے ہیں اور اس امر کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ان کی دونوں جانب میں بھی سامعین بیٹھے ہوئے ہیں۔

مقرر کو اس طرح گھوم کر تقریر کرنی چاہئے کہ ہر سمت سے اُس کی تقریر مساوی دلچسپی سے سُنی جا سکے۔ لیکن بہت جلدی جلدی گھومنے سے بھی سامعین کی آنکھوں پر

بار پڑتا ہے۔

مباحثوں میں طلبہ کو چاہئے کہ ہر دلیل کے آخر میں اپنے نقطۂ نظر کے لحاظ سے عنوانوں کو دھرائے اور سامعین پر تکرار سے یہ ثابت کردیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں درست ہے۔

مباحثے کی جماعت دو طالبعلموں پر مشتمل ہوتی ہے ان دونوں کی حیثیت گاڑی کے پہیوں کی سی ہے جن میں برابری کا رشتہ ہوتا ہے ورنہ مدرسہ بحیثیت مجموعی اول نہیں آسکتا۔ اکثر دیکھا گیا ہے۔ کہ مدرسوں سے تقریری مسابقت میں حصہ لینے کے لئے ایسی جماعتیں آتی ہیں جن میں ایک طالب علم تو اعلیٰ نشانات حاصل کرتا ہے لیکن دوسرے ساتھی کے محصلہ نشانات ناقابل بیان حد تک کم ہوتے ہیں اور اسی طرح اعلیٰ نشانات حاصل کرنے والا طالب علم بھی انعام سے محروم رہ جاتا ہے۔

ہر مباحثی جماعت کے اراکین میں سے ایک کو عنوان کی تائید اور دوسرے کو مخالفت میں تقریر کرنی پڑتی ہے اس لئے ان دونوں میں ہم آہنگی ضروری ہے۔ ورنہ خواہ مخواہ موافقت و مخالفت میں تقریر کرنے کی بحث میں الجھ کا تیاری کے لئے دئے ہوئے وقت کا ایک بڑا حصہ ضائع کردیا جاتا ہے اور اکثر اچھے مقرر کو بھی اپنے ساتھی کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے عنوان کے ایسے پہلو پر بحث کرنی پڑتی ہے کہ وہ خاطر خواہ نشانات حاصل نہیں کرسکتا۔

مقرروں کو چاہئے کہ مباحثے سے پہلے جو وقت تیاری کے لئے دیا جاتا ہے۔ اس عرصے میں حسب ذیل طریقے پر اشارے لکھ لیں لیکن بحث کے لئے مقرر کو دئے ہوئے وقت کے لحاظ سے اُن میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے:۔

مسابقتی امتحانات مفید نہیں ہیں۔

تائید:۔ (۱) عرصے کے تجربوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ

جن لوگوں نے ان امتحانوں میں کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ اپنی ذاتی صلاحیتوں کی بنا پر نہیں بلکہ تیاری کی بنا پر ہے۔

(۲) ان امتحانوں کے علاوہ اور بعض ایسے آزمائش کے طریقے بھی ہیں جن سے کہیں زیادہ تسلی بخش اور یقینی نتائج نکل سکتے ہیں۔

(۳) مسابقتی امتحانوں سے صرف ذہنی قویٰ کی نشوونما ہوتی ہے۔ جسمانی یا اخلاقی ترقی میں اس سے کوئی مدد نہیں ملتی۔ ان سے نکتہ دانی، شعور، خوبی قسمت کی صحیح آزمائش نہیں ہوتی۔ جو نری پڑھائی سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔

(۴) بعض ایسے لوگ جو نہایت سنجیدہ دل و دماغ کے مالک ہوتے ہیں اپنی صلاحیتوں کے مطابق قرار واقعی طور پر درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔

(۵) مختلف تجربوں سے معلوم کیا گیا ہے کہ ان امتحانوں سے امیدوار حد سے زیادہ محنت اور جگر سوزی پر مجبور ہوتے ہیں جن سے اُن کی صحت متاثر ہوتی ہے اور خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں ہوتے۔

(۶) بعض ایسے لوگوں کی بھی مثالیں ملتی ہیں جو بڑے دماغی اخلاقی اور جسمانی کام سرانجام دینے کے باوجود ان امتحانوں میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔

(۷) ان امتحانوں کا واحد مقصد یہ معلوم کرنا ہے کہ امیدواروں کے دماغوں میں کس قدر معلومات ہیں۔ لیکن اس بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ ان کے دماغوں سے کیا انمول کام لئے جا سکتے ہیں۔

تردید۔

(۱) چونکہ ان امتحانوں پر امیدوار انعامات یا خدمات کے مستحق قرار دئے جاتے ہیں

اس لئے اس میں ہر شخص کو برابر کا حق ملتا ہے۔ طرفداری اور سفارشی اثرات سے کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا۔

(۲) صرف یہی ایک صورت ہے جس سے تعلیمی حالت اور عام معلومات کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

(۳) مسابقت ہی پیشے اور تجارت کی جان ہے اور زندگی کا قانون، بہترین چیزوں کی تحصیل ہے۔ اس تحریک اور ترغیب کی مدرسہ میں بھی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ کاروبار میں۔

(۴) اگر امتحانات صحیح اصولوں، پر لئے جائیں تو ممتحن یہ آسانی سے ثابت کرسکتا ہے کہ وہ ایک بہت ہی مستحق اور موزوں امیدوار کا انتخاب کر رہے ہیں۔

(۵) ان امتحانوں کی بدولت بعض ایسے لوگ بھی جو اپنی زندگیاں گمنامی میں گزار رہے ہیں اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ترقی کی منزل تک پہنچ سکتے ہیں۔

(۶) تجربوں سے یہ معلوم ہوا ہے کہ ان امتحانوں میں صرف وہی لوگ کامیاب ہوسکتے ہیں جو جواب دینے میں حدِ اعتدال سے تجاوز نہیں کرتے۔ اس لئے ان امتحانوں کے نتائج زیادہ تشفی بخش ثابت ہوتے ہیں۔

گروہی مباحث

انسان فطرتاً ایک دوسرے سے ملنے جلنے اور تبادلۂ خیال کرنے کا عادی ہے زمانۂ حاضرہ کے متعدد مسائل ایسے ہیں جن پر ہر شخص کو ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے جس طرح انسانوں کی صورتیں ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہیں۔ اُن کے خیالات بھی ایک ہی مسئلہ کے متعلق جداگانہ ہو سکتے ہیں۔ اختلاف رائے کا لازمی نتیجہ مباحثہ ہوتا ہے۔ جہاں چار دوست مل کر بیٹھے اور کسی ایک مسئلہ میں دو مختلف رائیں ظاہر ہوئیں وہاں ان کی دوستانہ گفتگو مباحثی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

تقریر کا پہلا زینہ دوستانہ مباحث ہی ہوتے ہیں۔ انسان اپنے حلقۂ احباب میں تبادلۂ خیال کر کے ہی تقریر کے لئے تیار ہوتا ہے۔ دوستوں کی مفید اور بے لوث تنقید اور پُرخلوص حوصلہ افزائی مقرر کی ترقی میں ممد و معاون ہوتی ہیں۔

یہ مباحثے اس لئے بھی قابلِ قدر ہیں کہ دوست احباب ایک دوسرے کی نارسائیوں اور غلط فہمیوں کا پُرخلوص طریقے پر ازالہ کر سکتے ہیں۔ لیکن بعض کوتاہ نظر لوگوں کی غلط روئی کے باعث پرسکون فضا بھی متاثر ہوتی ہے۔

ان مباحثوں سے پروپیگنڈے کا بھی بہت کچھ کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنی جماعت کی سرگرمیوں کی ہر وقت مدح سرائی کرتا رہتا ہے اس تکرار کا ہی اثر ہے کہ بعض ایسے لوگ بھی غیر شعوری طور پر حامی و مددگار بن جاتے ہیں جن کو اس جماعت سے پہلے اختلاف تھا۔

ان مباحثوں کا آغاز معاشرتی زندگی کی ابتدا ہی میں ہوا ہے جن کے نظر افروز آثار آج بھی دیہاتوں کی سادہ زندگی میں دکھائی دیتے ہیں۔

عام سیاسی بیداری بھی ان مباحثوں ہی کی رہینِ منت ہے۔ ایسی جماعتیں خاص کر اُن ملکوں میں بہت زیادہ ہوتی ہیں جہاں اظہارِ خیال اور زبان پر حکومت کے استبداد کی مہر ثبت ہوتی ہے۔ جہاں ایسی صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔ ملک اور قوم کے چند سچے بہی خواہ، شب کے آرام کو خیرباد کہہ کے ایک جا اکٹھے ہو کر نظم و نسق پر تنقید کرتے اور حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حکومتیں ان خفیہ صحبتوں پر بہت زیادہ نگرانی رکھتی ہے اور اس کے کارندے ہمیشہ اُن کا پتا لگانے میں سرگرداں دکھائی دیتے ہیں۔

گروہی مباحثوں کی ابتدا بالکل غیر شعوری طور پر ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ اُن کی سرگرمیوں میں زیادہ تنظیم پیدا کی جاتی ہے۔ ان ہی مباحثوں کے باعث گروہی احساس بھی ترقی پاتا ہے جو جمہوریت کی روح ہے جس کے بغیر جمہوریت کا تخیل ایک ایسا خواب ہے جس کی تعبیر نہیں ہو سکتی۔

ان مباحثوں میں نہ تو کوئی صدر ہوتا ہے اور نہ کسی کے تفویض اس کی معتمدی کے فرائض ہوتے ہیں۔ بلکہ اس میں شرکت کرنے والا ہر شخص اپنے آپ کو ذمہ دار تصور کرتا ہے۔ یہ ذمہ داری کا احساس صرف تعلیم کے ذریعہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔

ان صحبتوں میں حصہ لینے والوں کی کوئی تعداد معین نہیں ہوتی لیکن ان کی زیادتی جماعت کے انتشار کا باعث ہوتی ہے۔ آج کل مدرسوں میں بھی گروہی مباحثوں کا خاص طور پر انتظام کیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی تعداد اور موضوع کا بھی

انتخاب ہوتا ہے۔ تاکہ وقت مقررہ میں صحبت کامیاب اور دلچسپ بنے۔ ان مباحثوں میں کوئی نگراں بھی مقرر کیا جاتا ہے جو صدر کے فرائض انجام دیتا ہے۔

اہل علم و بصیرت اصحاب کو بھی انجمنیں تبادلۂ خیال کے لئے مدعو کرتی ہیں تاکہ ملک و بیرونِ ملک کے ادیبوں اور سیاست دانوں کے خیالات سے آگاہی حاصل کر سکیں۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے۔ کہ انجمن کے اراکین سے ان ادیبوں اور سیاست دانوں کے راست تعلقات قائم ہوتے ہیں۔

ان گردہی مباحثوں میں لوگ موضوع سے ہٹ کر بھی گفتگو کرنے کے عادی ہوتے ہیں اور بحث میں خواہ مخواہ ہی طوالت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے آج کل موضوع مقرر کرنے کا رجحان عام ہے۔

نشری تقریر

ریڈیو کی ایجاد سے تقریر کی اہمیت اور افادیت میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے آج سے چند سو سال پہلے کسی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ کسی مقرر کو سامعین کی اتنی بڑی تعداد میسر آئے گی لیکن ریڈیو نے اس کا عملی ثبوت دیا ہے تقریر کی افادیت اس لئے بھی بہت زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ہزاروں میل کے لوگ کسی ایک مقرر کے خیالات سے یکساں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اکثر وہ لوگ جنھیں مطالعہ کے لئے وقت نہیں ملتا ریڈیو ہی سے اپنا ذوق پورا کرتے ہیں۔ ہمارے ادب کی کم مائگی کا یہ عالم ہے کہ ایسے مصروف لوگوں کے ذوقِ ادب کو پورا کرنے کا کوئی مناسب سرمایہ نہیں ہے اس لئے ریڈیو کے ذریعہ اس کی بہت کچھ تلافی ممکن ہوگئی ہے۔

ریڈیو سننے والوں میں مختلف طبائع کے لوگ شریک ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کے نظام العمل میں بھی ہمہ رنگی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تاکہ ہر طبیعت کا انسان اس سے فائدہ اٹھا سکے۔

ریڈیو چونکہ ایک تفریحی شغلہ ہے اس لئے اس کے نظام الاوقات میں ٹھوس اور بنیادی ادبیات کی نسبت مزاحیہ اور تفریحی ادب زیادہ شریک کیا جائے اس کے سامعین کی خواہش کے مطابق اس کے نظام العمل میں بھی روز بروز تبدیلی بھی ہوتی رہتی ہے۔

زمانے کے ترقی یافتہ رجحانات کے مطابق جدید اصولوں پر ہر صنف ادب نشری ضروریات کے لئے تیار کیا جا رہا ہے۔ خاص کر تمثیل نے خاصی ترقی کر لی ہے۔ تعجب نہیں کہ ٹیلیویژن عام ہو جائے تو نشری ڈرامے تھیٹر کی جگہ لیں اور ڈرامے تھیٹر کی جگہ نشرگاہوں ہی میں تمثیل کئے جانے لگیں۔

عام مقرر کے لئے دوسری پابندیوں کے ساتھ حرکات و سکنات میں بھی دلکشی پیدا کرنی ضروری ہے۔ اس سے نہ صرف سننے والوں پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ بلکہ اُن سے بڑی حد تک مقرر کا مطلب بھی واضح ہوتا ہے لیکن ایک ایسے مقرر کو جو کسی نشرگاہ سے تقریر کر رہا ہو سب سے زیادہ توجہ اپنی آواز، طرز بیان اور تلفظ پر دینی پڑتی ہے۔ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے وہ سامعین پر اثر ڈال سکتا ہے۔ آواز کے اُتار، چڑھاؤ کی دلکشی ہی سے سامعین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا سکتا ہے اور اس سے ہر چیز کی اہمیت بھی واضح کی جا سکتی ہے۔

نشری تقریر میں تلفظ کی صحت پر خاص طور پر زور دیا جاتا ہے اس لئے مقررین ان امور میں خاص احتیاط اور گہری توجہ سے کام لیتے ہیں۔ امریکہ میں ریڈیو کی مجلس انعامات نے متعدد مرتبہ وہاں کے ایک معلن کو اس کے صحت تلفظ اور آواز کی مناسبت پر انعام کا مستحق قرار دیا ہے اگر سامعین کے دماغ میں مقرر کی آواز سننے سے کسی قسم کا غلط خیال پیدا ہو تو آخر تک وہی خیال کارفرما رہے گا۔ نہ تو وہ مقرر کے حرکات و سکنات دیکھ سکتے ہیں اور نہ کوئی دوسرا ذریعہ ہے کہ اس غلط فہمی کا ازالہ کر سکے۔ گویا آواز ہی وہ ذریعہ ہے جس سے سامعین نشری مقرر کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہیں۔

ان ہی اسباب کی بنا پر منتظمین ریڈیو مضمون کا معیار جانچنے کے بعد مقرر کے لب ولہجہ اور آواز کا خاص طور پر امتحان کرتے ہیں اور ان لوگوں کو جن کا لب ولہجہ اور آواز نشری ضروریات کو پورا نہیں کرتی۔ تقریر کی اجازت نہیں دی جاتی اور مضمون معیاری ہونے کے باوجود محض آواز کی غیر موزونیت کی وجہ سے انھیں مایوس ہونا پڑتا ہے۔

ریڈیو پر تقریر صاف اور واضح آواز میں ہونی چاہئے اور اس میں اُتار، چڑھاؤ کے ذریعہ اثر پیدا کیا جائے جو لوگ ریڈیو پر تقریر کرنے کے عادی ہوتے ہیں ان کی آواز میں ایک خاص قسم کی دلکشی ہوتی ہے۔

تقریر کے دوران میں زور، زور سے سانس لینے، کھانسنے اور تیزی کے ساتھ کاغذوں کو الٹنے سے ناخوشگوار آواز پیدا ہوتی ہے جو ریڈیو سننے والوں کے لئے بیحد تکلیف دہ ہوتی ہے اسی طرح آلے کے دائیں بائیں گردن کو گھمانے اور لبوں میں دانتوں کو بار بار دبانے سے بھی کرخت آواز پیدا ہوتی ہے۔ نشری مقرر کو ان سے محترز رہنا چاہئے۔

اگر آپ کسی جلسہ میں خشک تقریر سُن رہے ہوں تو یہ امر اخلاق سے بعید ہے کہ جلسہ گاہ کو چھوڑ کر پُرسکون فضا کو متاثر کیا جائے اس کے برخلاف کسی ایسے مقرر سے جو کسی نشر گاہ سے تقریر نشر کر رہا ہو بیزاری پیدا ہو جائے تو ریڈیو کی سوئی کو پھرا دینا بہت آسان ہے۔ اس میں نہ تو اس امر کا اندیشہ ہوتا ہے کہ کوئی اس فعل کو بُرا کہے گا اور نہ یہ کہ جلسہ میں انتشار پیدا ہوگا۔ حالانکہ دونوں فعل، مقررین کے لئے لائقِ توجہ ہیں۔ کوئی مقرر ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ نعرشوں سے اُس کی بدنامی ہو

ریڈیو پر تقریر کرنے کی رفتار عام گفتگو سے کسی قدر تیز اور بلند آواز میں ہونی چاہئے ہر زبان کے لئے ایک ہی تناسب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ اس سلسلے میں صرف ایک عام اصول یہ بیان کیا جا سکتا ہے کہ رفتار اتنی تیز ہو کہ مقرر کے خیالات قبول کرنے کا موقع ملے ہر جملے کے بعد چند سکنڈ کا وقفہ بھی دیا جائے تاکہ جملہ کا مطلب واضح طور پر سمجھ میں آئے اس وقفہ سے ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ہر نئے جملے کو شروع کرنے سے پہلے مناسب لہجہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔

ان تمام امور سے کہیں زیادہ مشکل اور اہم متکلمانہ انداز بیان ہے۔ چونکہ نشری تقریریں پہلے ہی سے مرتب کر لی جاتی ہیں اس لئے تقریر میں یہ انداز بیاں پیدا کرنا نسبتاً مشکل ہے۔ نشری مقرر کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ وہ ہزاروں میل دور سننے والوں سے مخاطب ہے جو اسے دکھائی تو نہیں دیتے لیکن اس کی تقریر کی سماعت ضرور کرتے ہیں۔ اگر وہ لوگ مقرر کو دکھائی دیں تو یہ ممکن ہے کہ ان چہروں پر ناخوشگواری کے آثار دیکھ کر کسی مناسب طریقے پر اس کی تلافی کر دے لیکن نشری مقرر کو ایسے مواقع حاصل نہیں ہیں۔

نشری مقرر کو سب سے زیادہ وقت کا پابند ہونا چاہئے وہ اپنے مقررہ مختصر سے وقت میں سامعین کو خوش کرنے کے وہ سب ذرائع اختیار کرتا ہے جو چھوٹا، بڑا، جوان، بوڑھا، عورت، مرد سبھوں کو یکساں پسند آئیں۔ اُسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ مقررہ وقت سے ایک سکنڈ بھی زیادہ لے۔ اگر ایسا ہو تو مرتب شدہ نظام العمل میں زبردست تبدیلی کرنی پڑے گی اور سننے والے جن کو اس ترمیم کا کچھ علم نہیں ہوتا وقت کی عدم پابندی کے خلاف احتجاج کریں گے اس لئے خفیف

سی خفیف تبدیلی کا بھی فوراً اعلان کر دیا جاتا ہے تاکہ سننے والوں کو زحمت نہ ہو۔

نشری تقریر بہت جامع اور مختصر ہو۔ ایک اچھا مقرر مختصر سے الفاظ میں بہت کچھ نئی اور ضروری معلومات بہم پہنچاتا ہے۔ نشری تقریر کی زبان سادہ سلیس اور شستہ ہونی چاہئے تاکہ سب لوگ آسانی سے سمجھ سکیں۔ پیچیدہ خیالات کا اظہار سامعین کے لئے تضیع اوقات ہے۔ کوئی شخص بھی یہ گوارا نہیں کرے گا کہ اپنا وقت اس قسم کی لاحاصل تقریر کے سننے میں صرف کرے۔

نشری تقریر میں سادگی کے ساتھ زبان کی سلاست، روانی، شستگی اور شیرینی بھی ہونی چاہئے اور اس کے لئے ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں جو بہت زیادہ مانوس اور عام فہم ہوں۔

ابتدائی دور میں معلن زبانی اعلان کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے بار بار غلطیاں سرزد ہوتی تھیں اور سامعین اس ناخوش گواری کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جب اس کمزوری کا شدت سے احساس ہوا تو معلن بھی اعلان کو مرتب کر لینے پر مجبور ہو گئے۔ ایک معلن کے لئے اس قدر اہتمام اور تیاری کی ضرورت ہے تو یہ امر ظاہر ہے کہ تقریر کی تیاری میں بھی کافی محنت و کاوش ضروری ہے۔ تقریر صاف خط میں لکھی جائے یا مناسب تو یہ ہے کہ ٹائپ کروائی جائے۔ ٹائپ کرتے وقت صاف اور کھلے حروف کا خاص طور پر لحاظ کیا جائے اور صفحہ کی ایک ہی جانب ہو تاکہ کاغذ کے الٹنے کی زحمت نہ اٹھانی پڑے۔

ہر نشرگاہ کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اس کی خوبیاں دوسروں سے بڑھی چڑھی ہوں اور سابقت کے میدان میں سب پر سبقت لے جائے۔ ان کی اس

کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ایک لائق معلن ہے۔ معلن کی آواز میں شیرینی، لہجہ میں دل کشی اور الفاظ میں اثر ہو اور وہ تقریر کے اساسی اصولوں سے بھی اچھی طرح واقف ہو۔ معلن کے فرائض عموماً کسی جلسے کے صدر نشین سے ملتے جلتے ہوتے ہیں وہ ہر مقرر کا تعارف اسی انداز میں کرتا ہے۔ جیسے کسی جلسہ کا صدر کر رہا ہو تقریروں اور دوسری نشریات پر تبصرہ کرنے کا فرض بھی اسی کے ذمے ہوتا ہے۔

ہر نشرگاہ کی کامیابی اور خصوصیتوں پر منحصر ہے۔ پہلی خصوصیت تو یہ کہ نظام العمل نیا اور دلچسپ ہو اور دوسرے اس کی ترتیب میں ہر طبقہ و مذاق کے لوگوں کا لحاظ رکھا جائے۔

ریڈیو کی خبر رسانی اخباروں سے کہیں زیادہ اہم اور فائدہ مند ہے۔ خبروں کے نشر کرنے میں ایک حقیقت کا پہلو پوشیدہ رہتا ہے اور معلن کی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ اس طریقے سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس قبیل کی نشریات میں غیر ملکوں اور زبانوں کے نام ہوتے ہیں جن کا صحیح تلفظ ادا کرنا سخت مشکل کام ہے۔

اردو شاعری کا تاریک پہلو

نیاز فتحپوری کی تقریر جو حیدرآباد ریڈیو سے نشر کی گئی تھی۔

اس مرتبہ لکھنؤ سے حیدرآباد تک کا سفر بیک وقت تکلیف دہ بھی تھا اور دلچسپ بھی۔ تکلیف دہ اس لئے کہ گرمی شدید تھی، اور دلچسپ اس لئے کہ ایک بہت پُر تکلف قسم کے ہم سفر ہاتھ آگئے۔ جس وقت جھانسی میں مدراس اکسپرس پہونچا تو معلوم ہوا کہ حیدرآباد جانے والے ڈبے میں صرف ایک نشست اوپر کی خالی ہے۔ رات کا وقت تپتی ہوئی چھت قریب، پنکھا دور، سوال لیٹنے کا بھی نہ تھا، سونا کیسا، تاہم کروٹیں لیتا رہا اور معلوم نہیں کس وقت آنکھ جھپکی۔

نو بجے کے قریب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ نیچے ایک نشست پر کوئی فوجی گورا پڑا ہوا سو رہا ہے اور دوسری نشست پر ایک سُرخ سفید رنگ کے، نہایت باریک کترا ہوا نقشہ رکھنے والے خوبصورت نوجوان صاف ستھرا دسترخوان بچھائے ہوئے، پراٹھے اور کباب کا ناشتہ کر رہے ہیں۔ میں کھانسا بھی، کھنکھارا بھی، لیکن انھوں نے کوئی توجہ نہیں کی اور بدستور اطمینان سے کھانا کھاتے رہے۔ ریل کے سفر میں اگر کوئی اپنا ساتھی نہ ہو تو پھر میرا بہترین شغلہ یہ ہوتا ہے کہ ہم سفر لوگوں کے حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرتا رہوں چنانچہ کھانے کے دوران میں اور اس کے بعد بھی، میں ان کی ہر ہر حرکت کو دیکھتا رہا یہ صاحب، کے ایک نوجوان تھے جو دہلی سے آرہے تھے مجھے اُن کا نام معلوم ہے، بکس کے ایک لیبل پر درج تھا لیکن آپ کو بتاؤں گا نہیں۔ ہاں تو میں ان کو نہایت غور سے دیکھتا رہا اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ آدمی نہایت سلیقہ کے ہیں، لیکن الگ تھلگ

رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ سفر میں بے تکلفی کی رسم قائم کرنا مجھے بھی پسند نہیں، لیکن چونکہ میں نیچے کی نشست پر آنا چاہتا تھا اس لئے ان کو مانوس کرنے کا خیال پیدا ہوا اور پوچھا "حضرت کیا وقت ہے"، انھوں نے مجھے ایک بار دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر کلائی کی گھڑی میرے سامنے کر دی۔ مدعا یہ کہ میں آپ سے بات کرنا نہیں چاہتا۔ مجھے کچھ غصہ بھی آیا اور ہنسی بھی لیکن پھر خاموشی کے ساتھ اُن کا مطالعہ کرنے لگا۔ چند منٹ کے بعد اُنھوں نے اپنا بستر و تکیہ صاف کیا اور قمیص کی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور پنسل سے اس پر کچھ لکھنے لگے، لکھنے کا انداز یہ تھا کہ کبھی کھڑکی کی طرف دیکھ کر دیکھ سوچنے لگتے، کبھی پنسل منہ میں دبا لیتے، کبھی سر کھجانے لگتے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ اُن کی بے چینی بڑھنے لگی اور وہ اِدھر اُدھر چہل قدمی فرمانے لگے۔ ان کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے اور کبھی کبھی کاغذ کو دیکھ کر گنگنانے سے میں سمجھ گیا کہ یہ شاعر ہیں اور اس وقت شاعری کا نہایت زبردست دورہ اُن پر پڑا ہے۔ تھوڑی دیر تک تو میں اُن کی بے قراری و بیتابی کو دیکھتا رہا، لیکن پھر ضبط نہ ہوا۔ ایک تو مجھے اس بات کا غصہ کہ اُنھوں نے ناشتہ تنہا کر لیا اور مجھے پوچھا تک نہیں، دوسرے یہ کہ گھڑی گھڑی اِدھر اُدھر کھڑکیوں کے سامنے آکر ہوا کو روک رہے تھے۔ میں نے پوچھا "کیوں حضرت خیر تو ہے طبیعت کیسی ہے کہیں درد تو نہیں جو آپ اس قدر بے چین نظر آتے ہیں"۔ انھوں نے مجھے غضب آلود نگاہوں سے دیکھا اور بولے "معلوم ہوتا ہے جناب کو علمِ غیب میں بھی غیر معمولی ید طولیٰ حاصل ہے"۔ اُن کا یہ جواب سُن کر میں گھبرا اٹھا، وہ عربی کے ثقیل اور وزنی الفاظ استعمال کر کے مجھ پر رعب ڈالنا چاہتے تھے، میں نے جواب دیا "جی نہیں، عالمِ غیب ہونے کا ادعائے سفیہانہ تو نہیں

رکھتا۔ لیکن جناب کے اس بیمایانہ قیام وقعود اور کرب آمیز مشی و وقوف سے میں نے یہ اندازہ ضرور کیا ہے کہ شاید جناب کے امعاء مستقیم سے ریاح یا سودیٰ اعلیٰ کے طرف صعود کرکے یا تو فمِ معدہ پر متکاثف ہو رہے ہیں یا دماغ میں کیفیت ضغط پیدا کر رہے ہیں"، یہ سن کر اُن کا چہرہ سرخ ہوگیا اور کچھ سوچ کر بولے کہ "نیچے تشریف لائیے اُن کے تیور ایسے تھے جیسے کوئی یہ کہے کہ "اِدھر آ تو بتاؤں"، میں نے عرض کیا کہ "میں نیچے آنے میں اپنے لئے خطرہ محسوس کر رہا ہوں"، یہ سُن کر وہ مسکرا پڑے اور بولے کہ "نہیں، ایک شاعر سے کیا خطرہ؟"، میں نے کہا کہ "اخاہ، آپ شاعر ہیں، درست ہے، میں یہ تو سمجھ گیا تھا کہ جناب اس وقت شاعری فرما رہے ہیں، لیکن یہ اب تک نہیں سمجھ سکا کہ جناب شاعر ہیں، یا شویعر، متشاعر ہیں یا خنذیذ، وہ خنذیذ کو خنزیر سمجھے اور پھر چہرہ سرخ ہوگیا۔ میں نے کہا کہ "معاف فرمائیے، آپ نے خنزیر سمجھا، حالانکہ میں نے خنذیذ کہا تھا"، وہ خاموش ہوگئے، نہ انھوں نے خنذیذ کے معنے مجھ سے پوچھے نہ میں نے بتائے۔ اس کے بعد جب وہ اپنی جگہ چین سے بیٹھ گئے تو میں نے اس خیال سے کہ سفر میں لڑائی ٹھیک نہیں، عرض کیا کہ "مجھے جناب کا کلام سننے کا بڑا اشتیاق ہے، اگر حرج نہ ہو تو ....." میں اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ اُن کے چہرے سے مسرت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور بولے کہ "ضرور، نیچے تشریف لے آئیے"، ایک شاعر کو رام کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں کہ آپ اس کی شاعری سے دلچسپی کا اظہار کیجئے۔ میں اُتر کر اس عاشق و شاعر کے ریشمی گدّے پر بیٹھ گیا اور انھوں نے اپنا بکس کھول کر بیاض نکالنا چاہی، میں نے خیال کیا کہ اگر انھوں نے کہیں اس بیاض کے ذریعہ سے مجھ سے انتقام لینا چاہا تو بس کام ہی تمام ہے۔ اس لئے کہا کہ

حضرت! میں تو تازہ ترین کلام سننا چاہتا ہوں جو اس سفر کے دوران میں ہوا ہے۔"
شکر ہے کہ وہ کہنا مان گئے اور جیب سے کاغذ نکال کر فرمایا کہ یہ نظم ہے اور اس کا عنوان "مکتوب بہ جاناں" ہے۔ میں نے کہا کہ "مکتوب بجانا!" میں یہ محاورہ سمجھ نہیں سکا۔ بولے کہ "مکتوب بہ جاناں یعنے محبوب کے نام ایک خط" اور اس کے بعد وہ ہلکے لحن کے ساتھ پڑھنے لگے۔ اس نظم میں اُنھوں نے محبوب کو خطاب کرتے ہوئے وہی جذبات ظاہر کئے تھے جو عام طور پر ظاہر کئے جاتے ہیں یعنی فراق میں خواب و خور حرام ہو گیا ہے، ساری رات اختر شماری میں گزر جاتی ہے، سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہوں وغیرہ وغیرہ۔ میں یہ سنتا جاتا تھا اور دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ وہ شخص جو رات بھر پاؤں پھیلا کر نرم گدے پر چین سے سویا ہے، جس کے چہرے سے صحت و شباب کی سرخی ٹپکی پڑتی ہے، جس کی ریشمی قمیص پر ہاتھ رکھنے سے پھسل جاتا ہے، کیا ایسی غلط بیانیوں سے اسے شرم نہیں آتی، اور کیا اُس کا محبوب اس بات کا یقین کر سکتا ہے کہ واقعی وہ پریشان حال ہے۔ ایک مصرع اس نظم کا یہ بھی تھا کہ "کوہ و صحرا کی خاک چھانی ہے"، میں نے سن کر دل میں کہا "درست ہے لیکن سکنڈ کلاس میں بیٹھ کر!" خیر، اس کے بعد تو مجھ سے ان سے حیدر آباد تک کوئی بات نہیں ہوئی، لیکن میں دیر تک یہی سوچتا رہا کہ ہماری اُردو شاعری ہے کیا؟ آپ ولی سے لے کر بلکہ اس سے پہلے بھی کوئی قطب و ابدال قسم کا شاعر ہوا ہے تو اس کے عہد سے لے کر اس وقت تک کے اس جدید انقلابی شاعر تک جو افضل گنج کے پُل پر قصرِ امارت و سرمایہ داری میں آگ دینے والی نظم گنگناتا چلا جا رہا ہے، نگاہ ڈالی جائے تو صداقت کا عنصر آپ کو ہر دور میں بہت ضعیف نظر آئے گا جو دل میں نہ ہو وہ کہنا، یا جو نہ کر سکتے ہوں اس کا دعویٰ کرنا یہ ہے ہمارے شاعروں

کی وہ خصوصیت جو بلا استثناء ہر زمانے میں پائی جاتی ہے۔

ضیافتی تقریر

عشائیے اور عصرانے، سماجی زندگی کے لازمی اجزاء ہیں جن سے باہمی تعلقات خوش گوار بنائے جا سکتے ہیں۔ سرکاری اور غیر سرکاری ادارے اور انجمنیں ضروری موقعوں پر اس قسم کی تقریبیں منعقد کرتی ہیں۔ جہاں داعی اور دیگر متعلقہ اصحاب اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ ان تقریروں کا کوئی خاص موضوع قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ جن اغراض سے عشائیے اور عصرانے ترتیب دئے جاتے ہیں۔ اُن سے متعلق ہی تقریریں کیجاتی ہیں۔

ضیافتی تقریریں مختصر جامع اور دلچسپ و پُرلطف ہوں اگر تقریر ضرورت سے زیادہ طویل یا خشک ہو جائے تو اس سے کھانے کے بعد گرانی محسوس کی جائیگی۔ مختصر جملوں میں بعض لوگ نہایت ہی دلچسپ انداز سے ضیافتی تقریر کو اختتام پر پہنچاتے ہیں۔ اس غرض سے محفل کے شرکاء پر نظر رکھنی چاہئے اور اُن کے طبائع اور رجحانات کے اعتبار سے بھی تقریر کا انداز بیاں اختیار کیا جائے۔

ان تقریروں میں مزاح کا عنصر دوسری تقریروں کی نسبت زیادہ ہوتا ہے اور اس امر کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے کہ ایک تقریر کا سلسلہ دوسری سے کڑیوں کی طرح مل سکے۔

جام صحت :-

جام صحت تجویز کرنے کی رسم قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے یہ دراصل کسی

مشہور معروف اور قابلِ احترام شخص یا ادارے کی خدمات کے اعتراف کرنے کا ایک مناسب طریقہ ہے۔ مقرر جام صحت تجویز کرنے کے لئے اپنی جگہ پر کھڑا ہو جاتا ہے اور ممدوح کی تعریف و توصیف کرتے ہوئے اپنے دلی جذبات کا اظہار کرنے کے بعد حاضرین سے درخواست کرتا ہے کہ وہ جام صحت نوش کریں اس کی یہ درخواست ممدوح کے متعلق چند دعائیہ جملوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ حاضرین اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہو کر جام کا ایک گھونٹ پی لیتے ہیں۔

اگر وہ شخص جس کا جام صحت تجویز کیا گیا ہو محفل میں موجود ہو تو وہ جام صحت کا جواب دیتے ہوئے شکریہ ادا کرتا ہے اور اس طرح یکے بعد دیگرے مختلف ذی عزت اصحاب یا اداروں کے جام صحت تجویز کئے جاتے ہیں۔

آنریبل سید عبد العزیز کی تقریر

جو بتاریخ ۱۲ر اسفندار ۱۳۵۰ف ایوان تجارت کے عشائیے میں کی گئی تھی۔

معزز حضرات! ایوان تجارت حیدرآباد کا جام نوش فرمانے کی تجویز پیش کرتے وقت مجھے بے انتہا مسرت ہے۔ جس نے اتنی شاندار صحبت میں اتنی شاندار ضیافت سے ہمارے کام و دہن کی تواضع کی اور آپ نے ایوان تجارت کے صدر سے ابھی ابھی سنا ہے کہ یہ پہلی عام دعوت ہے جس میں مہمانوں کی اتنی کثیر تعداد شریک ہوئی ہو۔ انھوں نے ایک خوشگوار اعلان بھی کیا ہے کہ یہ ضیافت ہمیشہ کے لئے ایک سالانہ تقریب کی شکل میں بدل دی جائیگی کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو یہ چاہیں گے کہ پچھلے پچیس سال کی فروگزاشتوں کی تلافی کے لئے

یہ تقریب سال میں دو بار ہوا کرے۔ بہرحال معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ایوان تجارت نے بڑی ہوشمندی سے کام لے کر کفایت شعاری برتی ہے اور سماجی تفریحات و تقریبات کے مقابلہ میں جس کے متعلق بعض حلقوں میں یہ سرگوشیاں ہوتی ہیں کہ حیدرآباد غیر معمولی طور پر فیاض اور اولوالعزم واقع ہوا ہے، اپنے مادی اور اقتصادی مفاد کے استحکام و استواری پر زیادہ توجہ صرف کی ہے۔

ایوان تجارت کے لئے یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ رائٹ آنریبل سر اکبر حیدری کی سی زبردست شخصیت اور ایک ایسی جماعت جس کے قائد سر الگزینڈر راجر ایسے ماہر فن ہیں۔ اس کے پہلے عشائیہ میں مہمانانِ خاص کی حیثیت سے شریک ہیں۔

مجھے مسرت ہے کہ ڈاکٹر سر ضیاء الدین بھی پابندی وقت کے ساتھ اس دعوت میں تشریف فرما ہیں حالانکہ اپنے تبحر علمی کے باوجود وہ وقت کے متعلق اپنے حسابی تخمینوں میں بہت کم پکے پائے گئے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ مرکزی اسمبلی کے اجلاسوں کے سوا وہ اپنی دوسری مصروفیات کے مقررہ اوقات بھی اکثر بھول جانے کے عادی ہیں۔

حیدرآباد علم و ادب اور شائستگی کا ایک زبردست مرکز بن گیا ہے اور سائنس انجنیرنگ، میکانکس اور کارگزار صناعوں کا بھی مرکز بنتا جا رہا ہے۔ کاروبار اور تجارت میں بھی اُس نے ترقی کی منزلیں بہت دور تک طے کر لی ہیں نہ صرف بعض صوبہ جاتی حکومتوں نے بلکہ حکومتِ ہند نے بھی اپنے لائق ماہرین فن اور صناعوں کی خدمات حاصل ہونے کے باوجود لاینحل مسائل کی گتھیاں سلجھانے اور بڑی بڑی اسکیموں کی ترتیب اور نفاذ کے لئے بسا اوقات حیدرآباد کے انجنیروں کی خدمات حاصل کی ہیں۔

اس ایوان کا استقلال اور وقار اس تعلق کی بنا پر اور بڑھ گیا ہے جو نواب سالار جنگ بہادر

کو اس ادارے سے ہے اور جو اپنے قابل فخر اجداد کی شریفانہ روایات اور عظیم الشان قومی خدمات اور خود اپنی قابلیت اقتصادی فراست اور وافر دولت کے تمام اسباب کو سمیٹ کر بہت سے اشخاص اور اداروں کو اس کام کے لئے آمادہ کر سکتے ہیں کہ وہ اس ایوان اور مملکت کے اغراض و مقاصد کو تقویت پہونچائیں۔

میں اپنی نیز تمام مہمانوں کی طرف سے ایوان تجارت کی مہمان نوازیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ صاحبان سے درخواست کرتا ہوں کہ ایوان کی ترقی اور اقبال کے لئے جام صحت نوش فرمائیں۔

سپاس نامہ

ہر انسان کی دلی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے محسنوں کا بہتر سے بہتر طریقہ پر شکریہ ادا کرے اور ان کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کے مواقع بہم پہنچائے۔ سپاسنامے میں دلی جذبات اور بہترین تمناؤں کا اظہار کیا جاتا ہے

متمدن دنیا میں سپاسناموں کا رواج عام ہے اور ان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہر معمولی سے معمولی عہدہ دار کی خدمت میں بھی اس کے ماتحتیں سپاسنامے پیش کرتے ہیں۔

سپاسناموں کو مرتب کرنے کے لئے عام طور پر چند لائق اہلِ قلم منتخب کئے جاتے ہیں۔ چونکہ کسی ایک شخص سے سپاسنامے کی تدوین میں متعدد اراکین کی نمائندگی کا حق ادا نہیں ہو سکتا اس لئے بھی اس کی ترتیب و تدوین میں ایک سے زیادہ ذی علم اصحاب حصہ لیتے ہیں۔

سپاسنامے سیدھی سادی اور سلیس زبان میں لکھے جائیں بیچ، تلے الفاظ اور واضح جملے سپاسناموں میں خوبی پیدا کرتے ہیں۔

(۱) القاب (۲) تمہید (۳) مدعا

تشبیب کو جو درجہ قصیدے میں حاصل ہے وہی مرتبہ تمہید کو سپاسناموں میں دیا جاتا ہے قصیدے کے اختتام پر قصیدے کے مقام گریز کی طرح تعریف و توصیف کی ابتداء کی جاتی ہے اور آخری حصہ میں بہترین تمناؤں کا بھی اظہار کیا جاتا ہے۔

سپاس نامہ

بعالی خدمت آنریبل جناب مولوی سید احمد خان صاحب بہادر سی، آئی، ای، آئی۔ فخر اسلام
حامی قوم، بانئے مدرسۃ العلوم علی گڑھ

ہم اراکین انجمن اسلامیہ گجرات، کل اراکین انجمن کی طرف سے نیاز تاً خدمت اقدس میں نہایت عجز و انکسار سے اس سپاسنامے کے پیش کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ انجمن آپ کی اُن تمام کوششوں کا جو آپ ہمیشہ قوم کی اصلاح و بہبودی کے لئے فرماتے ہیں تہ دل سے شکریہ ادا کرتی ہے۔ ہم خداوند کریم کا ہزار ہزار شکر بجالاتے ہیں جس نے ایسے وقت میں جب کہ قوم کی ناؤ ادبار کے بھنور میں پھنسی ہوئی تھی علم سے ناآشنا تھی۔ تعصب کے دریا میں غرق تھی آپ جیسے ناخدا کو اس کشتی کے گرداب سے نکالنے اور اہل کشتی کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے پیدا کیا۔ آپ کی اُن مساعی جمیلہ نے ہماری مردہ قوم میں قومیت کی ایک نئی جان ڈال دی۔ مدت سے مہذب قومیں ہم کو نیم وحشی اور نامہذب کہتی تھیں اور ہم اُن کے ایسے الفاظ پر کچھ توجہ نہ کرتے تھے مگر اب ہم سمجھنے لگے ہیں کہ ہم کس حالت ابتر میں پڑے تھے اور اُس سے نکلنے کے کیا وسائل ہیں آپ نے نہ صرف وہ وسائل زبانی بتلائے بلکہ نہایت احسن طور پر مہیا بھی کر دیئے محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج علی گڑھ کو آپ نے ایسا عالیشان دارالعلوم بنا دیا جس کو قوم کے لئے تمام ترقیوں کی بنا اور تمام کمالات کی بنیاد تصور کرنا چاہئے۔ بالتخصیص ہم آپ کی اُن مساعی کا ذکر کرنا بھی نہایت ضروری سمجھتے ہیں جو مذہب اسلام کے حقائق و معارف کے ظاہر کرنے میں ممد و معاون ہوئیں۔ ہم یہ

بات بھول نہیں سکتے کہ ہماری قوم جو حقیقت میں مختلف النسل قوموں کا مجموعہ ہے صرف مذہب اسلام کے ہی رشتہ سے ایک قوم کہلاتی ہے مذہب اسلام کے ہی ذریعہ سے مسلمانوں نے نہایت اعلیٰ درجہ کی ترقی حاصل کی تھی اور اب اپنی بدبختی اور نالائقی کے سبب سے مذہب اسلام کو ایک ایسی چیز بنا دیا ہے جو بلا مبالغہ ہماری تمام خرابیوں کی جڑ اور تمام بدیوں کی بنیاد کہا جا سکتا ہے۔ مگر آپ نے اپنی کمال تحقیق سے دنیا پر یہ بات روشن کر دی کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو علوم کی روشنی کا خوب مقابلہ کر سکتا ہے۔ اگر نظر تحقیق سے دیکھا جائے تو علم سے عقل سے، فطرت سے، تجربہ سے اور ہر طرح سے سچا ہی سچا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہمارے تمام تنزل و بربادی کا اصلی سبب صرف یہی تھا کہ ہم نے اپنی ناسمجھی سے مذہب و معاشرت کو جو بالکل اور بالاستقلال علیحدہ علیحدہ شے ہیں ایسا غلط ملط کر دیا تھا کہ ان میں کوئی تمیز باقی نہ رہی۔ اور ایک سے نکلنا بغیر دوسرے سے خارج ہونے کے محض ناممکن ہو گیا جس سے کہ ترقی معاشرت کا رستہ بالکل مسدود ہو گیا۔ اب یہ عقدہ امتیاز صدہا برس کے بعد آپ نے ہی حل کر دکھلایا کہ جس سے ہم نے مذہب و معاشرت کو جدا جدا سمجھا اور حدیث "انتم اعلم" کی رمز کے سمجھنے کے آپ ہی مصداق ہوئے اور اسلام کے دریا کو اپنے اصلی بہاؤ پر لانے اور قوم کو اُسی عروج و ترقی کے مدارج پر پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ ہمارا شہر ایک چھوٹا سا شہر ہے اور بلحاظ علم فضل کے اس قابل نہیں ہے کہ آپ کی بیش بہا قومی خدمات کی پورے طور سے قدر کر سکے یہ صرف آپ کی کوشش اور اسلام کی برکت ہے جو نور اسلام رفتہ رفتہ ہر چھوٹے بڑے شہر میں آفتاب کی روشنی کی طرح پھیلتا جاتا ہے۔ آخر میں ہم اس سپاسنامہ کو اس دعا پر ختم کرتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ

آپ جیسے ہادیٔ حقیقت، حامیٔ قوم کا سایہ ہمارے سروں پر دیر تک قائم رکھے تاکہ نورِ اسلام آپ کی بدولت ملکوں، جنگلوں اور پہاڑوں میں پھیلے۔ آمین ثم آمین

جواب

اے بزرگان و برادران ساکنانِ گجرات

آپ نے جو اس دور دراز مقام سے سفر کر کے یہاں تشریف لانے کی تکلیف گوارا کی اور ایک سپاسنامہ مجلس اسلامیہ گجرات کی طرف سے میرے سامنے پیش کیا اس کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں اس وقت کہ میں نے پنجاب کے مختلف اضلاع میں سفر کیا تو لوگوں نے میری وہ عزت کی جس کے لائق میں نہ تھا مجھ کو اُن سپاسناموں سے جو مختلف مقاموں میں مجھ کو دئے گئے اور اُن مہربانیوں سے جو ہر ایک مقام کے بزرگوں نے میرے ساتھ کیں بہت فخر حاصل ہوا ہے مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے اس سپاسنامے سے جو خوشی مجھے حاصل ہوئی ہے اور جو عزت اس کے پیش ہونے سے میں اپنی سمجھتا ہوں وہ اُن سب سے زیادہ ہے اور مقاموں میں میرے معزز عالی درجہ دوست موجود تھے اور میں خیال کرتا تھا کہ جو کچھ ان مقاموں پر میری عزت کی گئی وہ صرف اُن بزرگوں کی محبت اور عالی حوصلگی کے سبب سے ہوئی جنھوں نے ایک شیشہ کے ریزے کو ہیرے کے مول پر خریدا لیکن گجرات ایک ایسا مقام ہے جس کے کسی شخص سے بھی میں واقف نہیں ہوں۔ وہاں کے بزرگوں سے بجز اخوت اسلامی جو بلاشبہ نہایت مستحکم رشتہ ہے اور کسی طرح کا تعلق نہیں رہا ہے ہاں وہ میرے اس وجہ سے مخدوم ہوں کہ میں اپنے تئیں تمام قوم کے خادم ہونے کے لائق ہونا خدا سے مانگتا ہوں

گو گجرات کے بزرگ میری آنکھ سے دور ہوں مگر میرے دل سے دور نہیں۔ پس ایسے شہر سے جس کے ساتھ ظاہری تعلقات نہیں ہیں مجھ جیسے ناچیز کے لئے ایک سپاسنامہ کا آنا بلاشبہ نہایت عزت اور نہایت قدر اور سب سپاسناموں پر ترجیح دینے کے لائق ہے۔ بھائیو! اس سپاسنامہ کے سننے سے ایک اور خوشی مجھے ہوئی ہے اور وہ یہ ہے کہ آپ نے میری ناچیز تحریروں کو ایسا سمجھا کہ جن سے اسلام کی حقیقی پاکیزگی ظاہر ہوتی ہے۔ بلاشبہ اسلام ایسا ہی پاک ہے اور خدا سے اُمید ہے کہ ہمارے دل میں جس قدر کہ ہم اس کی اصلیت پر غور کریں گے تو اُس کی پاکیزگی زیادہ منقش ہوتی جاویگی۔ مدت سے میں اس خیال میں تھا کہ ہماری قوم کی یہ حالت ہو گئی ہے جیسے ایک بند پانی نہ اُس میں اور کسی طرف سے پانی آتا ہے نہ اُس میں خود حرکت ہے۔ وہ روز بروز میلا اور گدلا ہوتا جاتا ہے مگر آپ کے تشریف لانے اور اس سپاسنامے کے پیش کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں اب ایک جوش پیدا ہو گیا ہے اور وہ سمجھنے لگے ہیں کہ اُن میں کچھ نقص ہے اب ہر جگہ سے اس کی صدا آتی ہے کہ ہم کو کچھ کرنا چاہئے یہ یقین مجھ کو آپ ہی کے سپاسنامے نے دلایا ہے اس لئے میں خدا کا اور آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

وداعی تقریر

انسان ہر طرف سے سماجی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ اگر ہم اپنی معاشرت کا غائر نظر سے مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ سماجی سرگرمیوں میں اکثر و بیشتر محض تعلقات خوشگوار بنانے کی خاطر پوری کی جاتی ہیں۔ اُن میں خوشی اور غم دونوں سرگرمیاں شامل ہیں اور ان ہر دو موقعوں پر اظہار خیال ضروری ہے۔

یہ بات انسان کی فطرت کے عین مطابق ہے کہ ساتھی کی جدائی کے موقع پر اپنے رنج و غم اور دلی تمناؤں کا اظہار کرے۔

وداعی تقریر دو حصّوں پر مشتمل ہوتی ہے:۔

پہلے حصّے میں جدا ہونے والے شخص سے اپنی محبت و خلوص کا اظہار کیا جاتا ہے اور دوسرے حصّے میں اُس کی جدائی پر ناخوش گواری کا اظہار اور اس کی کامیابی کی تمنا کی جاتی ہے۔

سپاس نامۂ وداعی

منجانب عہدہ داران و اراکین سررشتہ تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی

بخدمت جناب نواب مسعود جنگ بہادر بالقابہ ناظم تعلیمات سرکار عالی

جناب والا! ہم وابستگان سررشتہ تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی آج نہایت حزن و ملال کیساتھ جناب کو الوداع کہتے ہیں اس مفارقت کے موقع پر آپ کی ہمدردی اور احسانات جو آپنے اپنے ماتحتوں پر ہمیشہ کئے ہیں

یاد آتے ہیں تو ہماری زبان وقلم دونوں کی قوت اظہار الم کے لئے سلب ہوجاتی ہے سرکاری کاموں میں جب کبھی مشکلات پیش آئیں یا پیچیدہ مسائل پیدا ہوئے اُن کے حل کرنے میں جس توجہ اور کریمانہ اخلاق کے ساتھ ہماری مدد فرمائی وہ ہم کبھی بھی بھول نہیں سکتے۔

جناب والا! اس وقت جس امر کا اظہار ہمارے لئے سب سے زیادہ باعث فخر و ناز ہوسکتا ہے وہ یہ کہ جن امیدوں کے ساتھ حضرت اقدس واعلیٰ خلد اللہ ملکہ نے نظامت تعلیمات پر آپ کا انتخاب فرمایا تھا اس دوازدہ سالہ مدت میں اُن امیدوں سے کہیں بڑھ کر آپ کا حسنِ عمل ثابت ہوا۔

آپ کے مبارک وفیض بار عہد میں صرف لڑکوں کی تعلیم پر ہی توجہ موقوف نہیں رہی بلکہ متعدد زنانہ مدارس کو بھی فروغ ہوا۔

اسی طرح اساتذہ کو فن معلمی میں اعلیٰ تعلیم و تربیت دینے، تجارتی تعلیم کی ابتداء کرنے، اسکاؤٹنگ اور جسمانی تربیت کی ترقی کے لئے بہتر سے بہتر، جدید انتظامات بھی آپ ہی کے عہد نظامت کی یادگار ہیں۔

جناب والا کے اخلاقی اثرات عملی ترقی کے لئے معاون ثابت ہوئے اور ماتحتوں کے ساتھ جناب والا کے مشفقانہ اور کرم گسترانہ سلوک، ان کے سکونِ قلب وحوصلہ افزائی کا باعث ہوا۔ جناب والا کی برمحل امداد سے جیسے کچھ ہمارے حوصلے بڑھے۔ جناب کی خوش اخلاقی، عالی ظرفی، رواداری، ہمدردی اور حسن پروری نے جو گہرا نقش ہمارے دلوں پر چھوڑا ہے وہ کبھی نہیں مٹ سکتا۔

جناب والا کی خدمات سے نہ صرف سررشتہ تعلیمات ہی کو مستفیض ہونے کا

موقع بلا بلکہ جامعہ عثمانیہ، دارالترجمہ، دائرۃ المعارف، انجمن ترقی اُردو اور دیگر اداروں بھی جناب کی گراں بہا مدد کے ہمیشہ ممنون رہے ہیں۔

یہ بارہ سال کی مدت جس میں سررشتۂ تعلیمات کا نظم و نسق جناب کے سپرد رہا ایک یادگار زمانہ ہے اور ہم اپنے آپ کو خوش قسمت خیال کرتے ہیں کہ ہمیں ایک ایسے عالی خیال اور ہمدرد افسر کے ماتحت کام کرنے کا موقع ملا۔

آخر میں ہم درگاہِ ربّ العزّت میں دعا کرتے ہیں کہ آپ جہاں رہیں شاد و آباد رہیں آپ کی دلی آرزوئیں بر آئیں اور فرصت و آزادی کے زمانے میں آپ اپنے ملک کی ارفع و اعلیٰ خدمات انجام دے سکیں کہ زندگی کا اس سے زیادہ مبارک و مسعود مقصد دوسرا نہیں ہو سکتا۔

احسان مند و عقیدت آگیں

عہدہ داران و اراکین سررشتۂ تعلیمات

جوابی تقریر

حضرات! انسان کی زندگی میں کبھی ایسا بھی وقت آتا ہے جب کہ اس کو اپنے خیالات ظاہر کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اور میری زندگی میں وہ وقت یہی ہے۔

آپ نے ازراہ کرم میری جو کچھ تعریف کی اُس کا میں اپنے آپ کو مستحق نہیں پاتا ہوں گزشتہ بارہ سال میں سررشتہ نے جو کچھ ترقی کی۔ وہ اراکین سررشتہ کی کارگزاری کا نتیجہ ہے جس میں میرا حصہ بہت کم ہے۔

آپ نے جو خوب صورت کاسکٹ مجھے عنایت فرمایا ہے اس کو آپ کی محبت کی یادگار سمجھتا ہوں اور آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ ہمیشہ میرے پاس حفاظت سے رہے گا۔

حضرات! اس موقع پر اگر میں چند باتیں بطور نصیحت کے کہوں تو بے جا نہ ہوگا میں نے یہ محسوس کیا ہے اور محسوس کرتا ہوں اور محسوس کرتا رہوں گا کہ ہمارے ملک کے ارتقاء میں آنے والی نسل کے لئے تعلیم سے زیادہ کوئی چیز اہم نہیں ہے ہم تعلیم ہی کے ذریعہ ایک ایسی نسل تیار کر سکتے ہیں جو ہمارے وطن کو دُنیا کے ممالک میں اعلیٰ رتبہ پر پہنچائے گی۔

یہ یاد رکھیئے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں بجز محکمۂ تعلیمات کے، جس کے رکن ہونے کی آپ کو عزت حاصل ہے کوئی محکمہ بھی اس قدر اہم اور مفید کام نہیں کر رہا ہے صداقت اور وفاشعاری کسی محکمہ میں ایسی ضروری نہیں ہے جس قدر کے آپ کے محکمے کے لئے ضروری ہے اور اس کے ساتھ اس کو بھی نہ بھولیئے کہ آپ کو امداد باہمی کا اصول بھی پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔

مجھے بیرسٹری، مدرسی، پروفیسری اور نظامت کے تجربوں نے بتا دیا ہے کہ آپ بہت ہی ذمہ داری کی خدمت انجام دے رہے ہیں اگر آپ نے اپنے عیوب پر غور نہیں کیا اور اُن کے دور کرنے کی تدابیر اختیار نہ کیں تو اندیشہ ہے کہ اُن کے زہریلے اثرات سے آنے والی نسلیں متاثر ہوں گی۔ مُدرس تو وہ ہے جو دُنیا کا نقشہ بدلنے کی قوت رکھتا ہو۔ میں اُس دن کا منتظر ہوں جب کہ یہ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست اقتصادی اور تعلیمی حیثیت سے بھی سب پر سبقت لے جائے گی۔

آخر میں میری یہ دعا ہے کہ خدائے ذوالجلال ہمارے اعلیحضرت بندگانعالی کی عمر واقبال میں ترقی دے اور تاابد ان کا ملک سرسبز وشاداب اور اُن کی رعایا خوش وخرم رہے۔

تعزیتی تقریر

موت سے زیادہ دُنیا میں کوئی اور چیز یقینی نہیں ہے اس لئے ان لوگوں کے لبوں پر جو موت کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں نزاع کی حالت میں بھی تبسم رہتا ہے اور وہ خیال کرتے ہیں کہ موت کی امانت کو بغیر کسی خیانت کے واپس کرا رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے متعلق اظہارِ غم کیا جاتا ہے اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر قیمتی شئے کی صحیح قدر و قیمت اس کی گم شدگی پر ہوتی ہے۔ اس لئے کسی کی موت پر اپنے حزن و ملال اور اُس کی قدر و منزلت کا اظہار انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔

تعزیتی تقریر کی اصل غرض و غایت یہی ہے کہ قوم و ملک کے فدائیوں کی عزت و توقیر بڑھائیں اور نوجوان نسل کو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کے لئے اُکسایا جائے۔

تعزیتی تقریروں کا رواج بہت قدیم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ بعض مشہور اور تاریخی تقریریں آج بھی محفوظ ملتی ہیں جن سے اس زمانے کی سیاست اور معاشرت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ پیریکلیز کی وہ مشہور تعزیتی تقریر جو اُس نے رومہ کے بہادروں کی خدمات اور کارنامے گناتے ہوئے، کی تھی اور جس سے دُنیا کو پہلی مرتبہ جمہوریت کا علم ہوا اپنی نظیر نہیں رکھتی۔

تعزیتی تقریر کے حسب ذیل حصے ہوتے ہیں:-

(۱) تمہید۔ (۲) خدمات کا اعتراف۔ (۳) اظہارِ تعزیت۔
(۴) پس ماندوں کو تسلی۔ (۵) دعا۔

پیرک لیز کی مشہور تقریر تعزیت

ایتھنز میں مدت سے دستور چلا آتا تھا کہ جو لوگ ملک کی خدمت میں کام آجاتے تھے اُن کی ہڈیاں لڑائی کے میدان سے اٹھا کر شہر میں لائی جاتی تھیں تاکہ "سرامیکس" کے گورستان میں سرکاری خرچ سے اُنھیں دفن کر دیا جائے۔ "سرامیکس" شہر کا نہایت خوشنما حصہ تھا۔ موسم سرما میں جب لڑائیاں بند ہو جاتیں تو ایک دن اُن ہڈیوں کو دفن کرنے کا مقرر کیا جاتا۔ اس موقع پر ایتھنزیوں میں غیروں سے اجتناب کم ہو جاتا تھا اور جب یہ ہڈیاں اُٹھائی جاتی تھیں تو ہر کس و ناکس خواہ اپنے شہر کا ہو یا دوسرے شہر کا جلوس کے ساتھ ساتھ چل سکتا تھا۔ مدفن پر پہلے ہی سے مقتولوں کی رشتے دار عورتیں ماتم کے لئے موجود رہتی تھیں۔ جس وقت ہڈیاں دفن کر دی جاتیں تو کسی نیک نام و ذی علم شخص کو حکومت کی جانب سے مقرر کیا جاتا کہ وہ اُن کشتگانِ حبِ وطن کے ذکر میں ایک فصیح و بلیغ تقریر کرے۔ اس لڑائی میں پہلی مرتبہ جن لوگوں کی ہڈیاں "سرامیکس" میں دفن ہونے کے لئے آئیں اُن کے متعلق تقریر کرنے کے لئے "پیرکلیز" نامزد ہوا۔ یہی موقع ہے کہ مورخ توسی ڈائیڈیز نے ایتھنزیوں کے سوانح اور آئین کے متعلق نہایت سخن آرائی کے ساتھ، ایک تقریر پیرکلیز کی زبان سے ادا کی ہے اور جس دن سے اس تقریر کا علم دُنیا کو ہوا ہے یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ کوئی شرح اس

امریکی کہ حکومت عمومیہ کا اعلیٰ ترین نمونہ کیا ہونا چاہئے اس تقریر سے بہتر دنیا کے پردے پر موجود نہیں۔ پیرکلیز نے اصل مضمون شروع کرنے سے پہلے اس موقع پر تقریر کرنے کا جو دستور ہو گیا تھا اس کے متعلق چند اعتراض کئے اور کہا —

جن لوگوں نے بڑے کام کئے ہیں ان کا صلہ بھی بڑے کاموں سے ہو سکتا اور اس وقت جو رسم ایک احسان مند و منت گزار ملک اپنے شہیدوں کی ادا کرتا ہے وہ بھی بڑا کام ہے۔ لیکن ایسے موقع پر تقریر میں خطا ہو سکتی ہے اور یہ درست نہیں ہے کہ ان شہیدانِ وفا کی شوکت و شجاعت کے تذکرے کو محض ایک متنفس کی قوت بیان پر چھوڑ دیا جائے۔ ممکن ہے کہ وہ تقریر اچھی کرے یا بُری۔ مگر بہرکیف یہ خیال ضرور پیدا ہو جاتا ہے کہ یا تو اس کا بیان ضرورت سے زیادہ تھا یا ضرورت سے کم۔ لیکن حالت مجبوری کی ہے۔ قانون کا منشاء ایسا ہی ہے۔ اور اس لئے اس کی پابندی لازمی ہے۔

(اس کے بعد پیرکلیز نے ان بزرگوں کا ذکر کیا جو اُن سے پہلے گورستان "سرامیکس" میں آسودہ ہو چکے تھے اور بیان کیا)

ہمارے بزرگوں کا قبضہ نہایت قدیم وقتوں سے جو اب کسی کو یاد نہیں اس ملک پر چلا آتا ہے۔ یہ ملک وہ ہے جو کبھی حکومتِ غیر کے داغ سے بدنما نہیں ہوا اور یہ وہ امانت ہے جو ایک نسل دوسری نسل کو برابر سونپتی چلی آئی۔ یہ ہی ملک اصلی وطن آزادی و حریت کا ہمیشہ سے رہا ہے۔ ممالکِ غیر اور خود یونان کے شمال سے یورشوں کے طوفان تند و بلاخیز بارہا اُٹھے مگر ہمارے اسلاف نے بڑی بڑی

جانفشانیوں سے ان بلاؤں کو دور کر دیا اور اپنے اخلاف کو وہ سلطنت سپرد کر گئے جس کے آج ہم مالک و مختار ہیں۔ ہم میں سے بہت لوگ جو اس مجمع ماتم میں شریک ہیں ایسے موجود ہیں جنھوں نے اپنے باپ دادا کے متروکہ کو گھٹایا نہیں بلکہ بڑھایا ہے اور جنھوں نے اپنے جود و عطا سے شہر کی ہر ضرورت کو رفع کیا ہے جس سے وہ زمانہ صلح و جنگ میں غیر کے احسان سے بے نیاز ہو کر اپنی پوری شان و شوکت سے سب میں ممتاز و سرافراز ہے۔ اجازت چاہتا ہوں کہ وہ اصول کار اور آئین عمل بھی بیان کروں جن کی بجا آوری سے آج ہم اس درجۂ قوت و استحکام کو پہنچے ہیں اور ان قواعد و قوانین اور رسم و رواج کا ذکر بھی کروں جنھوں نے ہماری سلطنت کو آج اس پایۂ عروج کو پہنچایا ہے اور اس میں کلام نہیں کہ یہ بیان ایک مناسب تمہید اُن لوگوں کی تعریف و توصیف کی ہوگی جنھوں نے اُس شہر پر اپنی عزیز جانیں نثار کی ہیں۔ مجھ کو یقین ہے کہ اس بیان کو سُن کر جملہ حاضرین خواہ وہ اپنے ہوں یا غیر ضرور متاثر و مستفید ہوں گے"۔

ہمارے آئین و قوانین، ہماری سیاسی مجلسیں اور انجمنیں ایسی نہیں ہیں جو دوسروں کی نقل ہوں۔ وہ ہماری اپنی ہیں۔ اور مُدبرانِ ایتھنز کی خاص ایجاد سے ہیں۔ موجودہ مصطلحات سیاسی میں ہمارے طرز حکومت کو "ڈیموکریسی" (حکومت عمومیہ) کہا جاتا ہے۔ یہ نام صحیح بھی ہے اور غلط بھی، صحیح اس معنی سے ہے کہ ہمارے شہر اور سلطنت کا انتظام عموم کے ہاتھ میں ہے اور امیر ہو یا غریب، ہمارے ہاں سب کے لئے ایک ہی قانون ہے۔ غلط اس معنی سے ہے کہ تمام ریاست ہائے متعلقہ پر عموم کو ایک فضیلت و سرداری کا دعویٰ ہے۔

اس معنی میں ہماری حکومت ایک "ایرسٹوکریسی" (حکومت شرفا یا امراء) ہے۔ لیکن اس "ایرسٹوکریسی" کے ارکان یعنی شرفا یا امراء جو کچھ اختیارات وحقوق رکھتے ہیں اس وجہ سے نہیں رکھتے کہ وہ عالی نسب ہیں کیونکہ ہم نسبی مراعات وحقوق کو جائز نہیں رکھتے اور نہ ان امراء کو اپنے اختیارات وحقوق اس وجہ سے حاصل ہیں کہ وہ بڑے دولتمند ہیں کیونکہ مفلسی ہمارے ہاں مانع حقوق واختیارات نہیں بلکہ وہ امراء (ایرسٹوکریٹ) اس لئے کہے گئے کہ اُن کی امارت محض ان کی لیاقت پر منحصر ہے۔ یعنی ہماری ایرسٹوکریسی (حکومت امراء) وہ ہے جس میں عوام سے ہر شخص جو اپنی سلطنت کو فائدہ پہنچانے کی لیاقت وقابلیت رکھتا ہو مستحق ہے کہ بلا مزاحمت اپنی سلطنت کو فائدہ پہنچائے۔

اور یہ ہی اصلی آزادی وحقیقی حریت ہماری سیاسی زندگی کی ہے اور اسی طرح ہم اپنی معاشرت اور سوسائٹی میں بھی قیدوں سے آزاد ہیں۔ ہر شخص آزاد ہے کہ جو کام یا پیشہ چاہے اختیار کرے۔ اس میں نہ اُس کی کوئی ذلت سمجھی گئی ہے اور نہ کوئی بدگمانی اس کی جانب سے پیدا ہو سکتی ہے۔ ہماری عادت کے خلاف ہے کہ کسی ایک ہی طریقے کے غلام ہو جاویں۔ یا اپنے گرد ایک حلقہ باندھ کر بیٹھ جاویں جس میں دوسرے کو نہ آنے دیں۔ ہم کسی شخص کو اس وجہ سے کہ اس کا طریقہ ہم سے جدا ہے۔ اپنی صحبت سے علیحدہ نہیں رکھتے لیکن اس بلا قید آزادی کے ساتھ ہم میں اپنے بزرگوں کا پاس ادب اور ہر متبرک شئے کو تعظیم کی نظر سے دیکھنے کا بے حد خیال ہے اور یہ وہ چیز ہے جو ہمارے ہر فعل وعمل میں۔ ہماری ہر تقریب وانجمن ہماری شہری زندگی کا جزو اعظم ہے۔ حاکم کی حکومت کے سامنے ہماری گردن خم رہتی ہے

قانون کی پابندی کو اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں۔ سزا کے خوف سے نہیں بلکہ اس کو اپنی زندگی کا اصول سمجھ کر۔ تمام احکام میں سب سے بڑھ کر جس حکم کی وقعت ہمارے دل میں ہے وہ یہ کہ ایسے زیر دستوں کو پناہ دیں جو زبردستوں کا مقابلہ کرنے سے معذور ہوں۔ ہمارے ہاں ایسے قوانین بھی موجود ہیں جو نہ کبھی ضبط تحریر میں آئے ہیں اور نہ کسی قانونی سزا یا تدارک کے ساتھ نافذ ہیں۔ مگر باوجود اس کے جو شخص ان کے خلاف ورزی کرتا ہے وہ مستوجب ملامت و نفرین ہوتا ہے۔

غرض پہلے ہم نے آزادی حاصل کرنے کی کوشش کی اور پھر خوش رہنے کی ہمارے شہر میں جس کثرت سے جشن و جلوس، کھیل تماشے، جسمانی ورزشوں کی مہتم بالشان جلسے ہوتے رہتے ہیں اور کسی شہر میں نہیں ہوتے۔ ان سے محنت و مشقت کے بعد تفریح ہوتی ہے۔ ہمارے گھروں کو دیکھیے تو ہر طرف نفیس و خوشنما چیزیں، لطافت و شائستگی کے سامان نظر آئیں گے۔ ان سے بڑھ کر کوئی طلسم افسردہ دلی کے دور کرنے کا نہیں ہے اور یہ ہمارے شہر کی شہرت اور بزرگی کا باعث ہے کہ دنیا بھر کی پیداوار اس میں مہیا رہتی ہے اور دور دور کے ملکوں کی قدرتی نعمتیں بھی ہم گھر بیٹھے اسی طرح چکھتے ہیں جیسے کہ "ایٹیکا" کے میوے اور پھل۔

جیسے تفریحات اور خوش بسری کے ہم شائق ہیں ویسے ہی ایک شہری کے سخت مدنی فرائض ادا کرنے میں بھی ہم جفاکشی اور سرگرمی کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے جن وسائل سے ہم اس درجہ ترقی کو پہنچے ہیں وہ کوئی راز سربستہ نہیں جن کو دوسروں سے ہم نے پوشیدہ رکھا ہو۔ جس کا دل چاہے ہمارے شہر میں آئے اور جو کچھ ہم سے سیکھنا یا پوچھنا ہو وہ سیکھے اور پوچھے۔ تعلیم و تربیت کے وقت ہماری طبیعت

پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جاتا لیکن باوجود اس کے ہماری تربیت ایسی ہوتی ہے کہ جب آزمائش کا وقت آتا ہے تو پھر ہماری ہمت کسی چیز میں قاصر نہیں ہوتی۔ طبیعتیں آزاد، دل خوش، قانون سے مستغنی کیوں کہ خود ہماری طبیعت قانون کا حکم رکھتی ہے۔ ہم ہر کام میں ان لوگوں کی طرح جان کھپانے کو تیار ہو جاتے ہیں جنھوں نے خطروں کے انتظار اور ان کے مقابلے کی فکر و تدبیر میں عمریں بسر کر دی ہیں اور پھر بھی ہم ہی اُن سے زیادہ نفع میں رہتے ہیں۔

مکرر کہتا ہوں کہ ہم لوگ ارادہ بھی رکھتے ہیں اور عمل بھی۔ ملک پر زندگی وقف کر کے جینا ہماری اصلی زندگی ہے۔ ہمارے نزدیک حسن و خوبی ایسی چیزیں نہیں ہیں جو آسمان سے نیچے اُترنا ہی نہ جانتی ہوں بلکہ وہ گھر کی معمولی چیزوں اور گھر کے انتظام سے مغائر نہیں ہیں۔ انسان پھر انسان ہے گو وہ اپنی طبیعت کو ریاضت سے عرش پر پہنچا لے۔ ہم ایک معمولی شہری کو مدبر کے درجے سے علٰحدہ نہیں سمجھتے۔ اگر کسی کو اپنے ذاتی کاروبار سے اتنی مہلت نہیں ملتی کہ وہ انتظام حکومت میں حصہ لے سکے تو ہم یہ کہہ کر خاموش نہیں ہو جاتے کہ اس کو اپنے بچ کے کاموں سے فرصت نہیں ہے بلکہ اس کو ملک کا ایک خادم ناکارہ تصور کرتے ہیں۔ اگر ہم کسی سیاسی تحریک کو عمل میں نہیں لا سکتے تو اتنا ضرور کرتے ہیں کہ اس کے متعلق ایک مستقل رائے قائم کر لیں۔ کیونکہ ہمارے نزدیک کسی معاملے پر مل کر بحث کرنی اس پر عمل کرنے کا پہلا زینہ ہے۔ ہماری دلیری و جواں مردی، جہالت یا حماقت کا نتیجہ نہیں ہوا کرتی۔ بلکہ ہم آنکھیں کھول کر نقصان کا دام دام گنتے ہوئے خطروں میں گھستے ہیں۔ مگر باوجود اس کے ہمارا مسلک سیاسی یہ نہیں ہے کہ ہر وقت اپنا ہی نفع سوچا کریں۔ جس قدر ہم نے

سلوک اور مہربانی سے دوسروں کے قلوب کو تسخیر کیا ہے اور جس قدر ہم نے اپنے سود و زیاں سے قطع نظر کر کے محض حریت کو اپنا دین و ایمان جان کر دوسروں کی مدد کی ہے۔ وہ کسی اور قوم سے بن نہیں پڑی۔ ہمارا شہر وہ ہے جس سے کل یونان اور یونان کی دُنیا کو سبق لینا چاہئے۔ کہیں کا آدمی لے لیجئے مگر اتھنز کے ایک شہری کے برابر شائستگی میں کامل اور ہر فن کا شیفتہ و شائق نہ نکلے گا۔ اتھنز ہی میں بہت سے اوصاف نکلیں گے اور ہر وصف قابل تعریف ثابت ہوگا۔ تمام شہروں میں صرف یہ ہی شہر ایسا ہے جو اپنی شہرت سے بالاتر ہے۔ کسی شاعر کی مدح سرائی کا وہ محتاج نہیں۔ تمام خشک و تر اس کی فتوح و مہام کا شاہد ہے اگر دشمن کو شکست دیتا ہے تو اس کی آبروریزی نہیں کرتا۔ جو قومیں اس کی مطیع و منقاد ہیں وہ بھی گواہی دے رہی ہیں کہ حکومت کرنی حقیقت میں اس کو زیبا ہے

ایسے ہی قابل تعریف شہر سے یہ لوگ تھے جنھوں نے اس کی خدمت میں اپنی جانیں نثار کر دیں اور جن کے دفن کے مراسم ادا کرنے کے لئے اس وقت ہم سب یہاں حاضر ہوئے ہیں۔ شہر کی تعریف دراصل شہر والوں کی تعریف ہے جنھوں نے شہری ہونے کا حق ادا کر کے اپنے شہر کو ایسا بنا دیا جیسا کہ آج وہ سب کو نظر آرہا ہے۔ جیسی موت ان لوگوں کی ہوئی ہے اس سے بہتر کس کی تقدیر ہو سکتی تھی۔ ایسی ہی موت وہ تقدیر ہے جو انسان کے حق میں مشیت کا بہترین اندازہ کہی جا سکتی ہے خواہ وہ کسی کے اعمال نیک کی ابتداء میں پوری ہوئی ہو اور خواہ انتہا میں۔ یہ وہ لوگ تھے جو حب وطن میں جان پر بازی لگا کر دوڑ پڑے اور پھر اس دوڑ میں کوئی چیز ان کو نہ روک سکی۔ نہ دل کی آرزوئیں نکالنے کا

خیال مانع ہوا۔ نہ تلافی مافات کی امید میں جان عزیز ہوئی۔ نہ ترک دولت کے خیال نے اور نہ حالت مفلسی میں اپنوں کو بے کس چھوڑنے کے افسوس نے اُن کی رفتار میں فرق پیدا کیا۔ محض انتقام اور پاس و ناموس پر ہمتیں باندھ لیں اور جب وقت آگیا تو گریز و فرار کی حالت خوف میں نہیں بلکہ فتح و نصرت کے نشان دیکھتے ہوئے کاری زخم کھا کر زمین پر گر پڑے۔

ان کی مثال ہم پس ماندگاں کو ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے اور دعا کرنی چاہئے۔ کہ وطن کی خدمت میں ہم کو زیادہ عمریں نصیب ہوں۔ میں اس وقت ان برکتوں کو بیان کر کے جو وطن کے دشمنوں کو پامال کر کے ملا کرتی ہیں تمھاری طبیعتوں کو بے قرار کرنا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ ابھی ملک کی خدمت گزاری کے لئے اس سے بھی بڑھ کر کام کرنے باقی ہیں۔ ذرا اس عالیشان شہر کو دیکھو اور اس کی وسیع و زبردست سلطنت کا خیال کرو۔ اس کی خوب صورتی و خوش نمائی کا عشق اپنی ہر رگِ جان میں پیدا کر لو اور یاد رکھو کہ یہ اُسی کے باشندوں کی ہمت و استقلال، ادائے خدمت اور کسبِ وقار کا نتیجہ ہے کہ آج وہ اس رفعت کو پہنچا ہے۔ ان کی کوششیں خواہ ناکام رہی ہوں مگر وہ خود وفاداری میں مرتے دم تک ثابت قدم رہے۔ اور جب کوئی چیز پاس نہ رہی تو جان نظر کر دی۔ ان کی خدمتوں کا صلہ جس قدر ہو کم ہے۔ ان کی شان کبھی نہ مٹے گی۔ ان کی لحد تو بے شک یہ ہی چار ہاتھ لمبی زمین رہے گی جہاں اُن کی مٹی رکھ دی ہے لیکن ان کا مزار تمام عالم ہوگا اور ان کے مزار کا کتبہ کسی پتھر پر کندہ نہ ہوگا۔ بلکہ بنی نوع انسان کے لوح دل پر نقش رہے گا اور جہاں کہیں انسان کے بڑے بڑے کاموں کا ذکر ہوگا وہاں اُن کے نام بھی

لئے جائیں گے۔

جو لوگ اس طرح مرتے ہیں موت ان کے حق میں کوئی نقصان نہیں ہوتی۔ میں اُن کے والدین سے شریک ماتم ہو کر عرض کرتا ہوں کہ ذرا زندگی کے انقلابات واتفاقات پر غور فرمائیں۔ اس زندگی میں وہ ہی اچھا رہا جس کی زندگی گو کم ہوئی مگر راحت وعزت سے گزری۔ میں جانتا ہوں کہ ایسی باتوں سے آپ کے دلوں کو صبر آنا مشکل ہے۔ اس وقت آپ دوسروں کو اس نعمت سے متمتع دیکھ رہے ہیں جو پہلے اپ کو بھی نصیب تھی مگر آج اس سے محروم ہیں۔ مگر میں یہ ہی کہوں گا کہ اپنا دل نہ توڑئے بلکہ اس درد کو صبر کے ساتھ برداشت کیجئے۔ آپ میں بعض ایسے ہیں جن کے ابھی اور اولاد ہوگی۔ جو بچے اس وقت کم سن ہیں جوان ہو کر اُن کی جگہ حاصل کریں گے جنھوں نے ملک کی خدمت میں جانیں دی ہیں۔ گھر میں جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ پھر بھر جائے گی اور شہر کی جو طاقت کم ہوئی ہے وہ پوری ہو جائے گی۔ مگر جن کو اب اولاد کی امید نہیں ہے وہ اس خیال سے اپنے دل کو تسکین دے لیں کہ زندگی کا ایک حصّہ بہت اچھی طرح گزر چکا ہے اور حصّہ بھی وہ جس کی مدت نسبتاً زیادہ تھی، مگر جو تھوڑا حصہ عمر کا باقی ہے اس تعظیم وتکریم کے مستحق رہیں گے۔ جو پیرانہ سالی کا سب سے بڑا نور اور مایۂ تسلی ہے۔

ان لوگوں کے واسطے جو ان مرنے والوں کی اولاد واعزّہ ہیں ایک سخت مرحلہ باقی ہے۔ انسان جب تک زندہ رہتا ہے کچھ نہیں لیکن جب وہ مر جاتا ہے تو اس کے کام انسان سے بالاتر سمجھے جاتے ہیں۔ پس نیک اور شریفانہ کاموں کے لئے مجاہدہ کرنا تمھارا کام ہے۔ نیکی ہی وہ چیز ہے جو کینہ اور بہتان کی دسترس سے باہر ہے۔

ان شریف وعفیف بیویوں کے لئے جواب بیوہ ہوکر زندہ رہیں گی مجھ کو چند مختصر جملے کہنے ہیں۔ وہ ہی شریف بی بی سب سے اعلیٰ رتبہ رکھتی ہے جس میں عورت کی صفات جو عورت کے ساتھ اتری ہیں موجود ہوں اور وہ شریف بی بی نیک نامی وشہرت کی سب سے زیادہ مستحق ہے جس کا نام بھلائی یا برائی سے کبھی مردوں کی زبان پر نہ آیا ہو۔

اب مجھے کچھ اور کہنا باقی نہیں۔ کام جو کچھ باقی ہے وہ شہر کی حفاظت ہے اور شہر ہی اپنی حفاظت کے صلے میں ان مرنے والوں کے یتیموں کو پروان چڑھائے گا کیونکہ یہ ہی وہ انعام اور پھولوں کا تاج ہے جو وہ اپنے شہریوں کو دیتا ہے۔

پس لوگو! جب ماتم ختم کرلو تو اپنے گھروں کو رخصت ہو۔

سر سیّد احمد خاں

سر سیّد ہندوستان کے شہرۂ آفاق مصنفین اور قائدین میں سے تھے انھوں نے عرصۂ دراز تک مسلمانوں کی اس ناگفتہ بہ حالت کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جو سلطنتِ مغلیہ کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد ان کی تہذیب و تمدن کی ان گنت خرابیوں کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے بڑی جانفشانی سے وہ ذریعے دریافت کئے جو قوم کی اصلاح کے لئے مفید ہو سکتے تھے۔ انھوں نے قوم کو بیدار کرنے کے لئے تحریر اور تقریر دونوں سے مدد لی۔ تحریر میں انھوں نے نیا اسلوب اختیار کیا جس کی دوسروں نے تقلید کی۔ اس میں حالی، شبلی، ذکاء اللہ، وقار الملک اور محسن الملک جیسے یکتائے روزگار مصنفین شریک تھے جن کی سیدھی سادی تحریروں نے ہندوستان کے طول و عرض میں عام بیداری کی روح پھونک دی اور اُن کے تعاون عمل سے ہی تہذیب الاخلاق کی اجرائی عمل میں آئی جس کی مدد سے انھیں اپنے خیالات کی ترویج و اشاعت میں کافی مدد ملی۔

سر سیّد صرف انشاء پرداز ہی نہیں تھے بلکہ تقریر کے فن میں بھی کمال رکھتے تھے۔ اس بزم کے دوسرے اراکین میں محسن الملک، نذیر احمد وغیرہ شامل تھے جن کی جادو بیانی سے مسلمانوں میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوا۔

سر سیّد کی تحریر کی نمایاں خصوصیت سادگی تھی وہ مشکل اور ادق مسائل بھی عام فہم انداز میں کچھ اس طرح بیان کر جاتے تھے کہ اس میں حسن اور دلکشی پیدا

ہو جاتی تھی۔ وہ اپنی تقریر میں بھی سادہ بیانی میں کامیاب رہے۔ ان کی تقریر کا کمال یہی تھا کہ وہ مشکل اور دشوار مطالب، کچھ اس انداز سے آسان و سلیس زبان میں بیان کرتے کہ سامعین کے دلوں پر نقش ہو جاتے تھے۔

سرسید کو خدا نے نکتہ رس دماغ، دور رس نگاہ اور دردمند دل دیا تھا ان تینوں خصوصیتوں کے باعث وہ وسیع تجربے اور مشاہدے کے مالک تھے۔ اس عمق بینی اور قوم کی دردمندی ہی کی بدولت انھوں نے اس کی ترقی و زوال کا نہ صرف مطالعہ کیا بلکہ اس کے لئے نہایت ہی زود اثر نسخہ تجویز کیا تھا اور لوگوں کو ان کی اپنی بہتری و فلاح کے سوچنے کا موقع بہم پہنچایا۔ اُن کی تقریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قوم کی کمزوریوں کو دیکھ کر ایک سچے ہمدرد اور جان نثار کی طرح اپنے آپ کو ملک و قوم کی خدمت کے لئے پیش کیا۔ اُن کی تقریر کے ہر لفظ سے صداقت و خلوص ٹپکتا ہے اور وہ ہر چیز کا اس مؤثر انداز میں نقشہ کھینچتے ہیں کہ آنکھوں میں اُس کی تصویر پھر جاتی ہے۔

وہ اپنے تاثرات ایک جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں:۔

"اے دوستو! ایک زمانہ تھا کہ ہمارے باپ، دادا، اپنے حاصل کئے ہوئے علوم پر فخر کرتے تھے۔ ہندو صاحبوں کے باپ دادا کا بھی ایسا ہی حال تھا وہ فخر بے شک ہمیشہ رہے گا اور اُن بزرگوں کے نام عزت سے لئے جائیں گے۔ لیکن اس زمانے میں یہ چیز دیکھنے کے قابل ہے کہ کونسی چیز اب ہم کو اور ہمارے ملک کے لئے مفید ہے۔"

مقرر اگر مشاہدہ کی افادیت اور اہمیت کو نظر انداز کر دے تو ناممکن ہے کہ

وہ اس زور بیان کے ساتھ اپنے دل کی پوشیدہ باتیں جو سماج کی فلاح و بہبود سے متعلق ہوں بیان کر سکے۔ سرسید نے شاہدے ہی کی بدولت اپنی تقریر میں اس قدر زور پیدا کیا جس میں ان کے مطالعہ سے تقویت پہنچتی تھی۔ وہ اپنی تقریروں میں جو بھی بات بیان کرتے ہیں وہ ان کی عینی شاہدہ کا نتیجہ ہوتی ہے۔

خدا نے سرسید کو ایک دردمند دل عطا کیا تھا اور ان کی رگ رگ میں قوم کی محبت سما گئی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے مشاہدوں سے متاثر ہوتے اور ان کی طبیعت میں جو تجسس کا مادہ تھا اس کی مدد سے ان کو عمل کی کسوٹی پر کسنے کے عادی تھے، جب اس کی اصلیت کا علم ہوتا تو فوراً وہ کوئی مجرب نسخہ تجویز کر دیتے تھے۔ ایک جگہ وہ ان زہریلے عناصر کا ذکر کرتے ہیں جو قوم کے جسم میں داخل ہو کر اس کی خوشگوار اور صحت مند زندگی کو متاثر کر رہے تھے۔ چنانچہ وہ ایک جگہ اس دل کش انداز میں قوم کی تباہی کا نقشہ کھینچتے ہیں۔

"میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ قوم کے لئے بہت کچھ کرنا ہے۔ قوم کو بہت چیزوں کی ضرورت ہے۔ اس کی مثال ایک ایسے مریض کی ہے جو متعدد امراض میں مبتلا ہو بعض ایسے امراض ہیں جن سے ان کی ہلاکت کا اندیشہ نہیں اور بعض ایسے ہیں جن سے ان کی ہلاکت کا قوی اندیشہ ہے۔ پس اگر ان امراض کے علاج پر متوجہ ہو گے جس سے ہلاکت کا اندیشہ نہیں ہے، اور سب مل کر اس مہلک مرض کے علاج پر متوجہ نہ ہو گے جو ایسا مرض ہے کہ چند آدمیوں کے متوجہ ہونے سے اس کا علاج نہیں ہو سکتا تو اس بیماری کو شفا ہونے کی کوئی توقع نہیں ہے بلکہ آخر کار یقینی اس کے لئے موت ہے۔ پس اگر تم اس کی شفا چاہتے ہو تو ایک دانا طبیب کا سا

کام کرو۔ چھوٹے چھوٹے امراض کو جو درحقیقت نہ ہونے کے برابر ہیں بلکہ اصلی مرض کے سبب سے پیدا ہوتے ہیں ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو اور سب متفق ہو کر اصلی مہلک مرض کے علاج پر پوری ہمت صرف کرو تاکہ وہ زائل ہو جائے۔"

سرسید کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کی تقریروں کو دیکھنے سے وسیع معلومات اور گہرے مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا حالی حیات جاوید میں تحریر فرماتے ہیں۔ مطالعہ کی عادت ابتداء سے ان کی رفیق رہی۔ سرسید کا مطالعہ نہ صرف دل بہلانے یا عبارت کا لطف اُٹھانے کے لئے ہوتا تھا اور نہ کتاب دانی کی غرض سے بلکہ ان کا مطلب صرف مصنف کے خیالات سے اطلاع حاصل کرنا ہوتا تھا

سرسید نے مغربی تعلیم تو حاصل نہیں کی تھی لیکن اپنے وسیع مطالعہ کی بدولت وہ ہر قسم کے علم سے آشنا ہو گئے تھے اور ملک و قوم کی خدمت کے باعث اُنھیں سیاست سے بھی دوچار ہونا پڑا۔ زبان کی سلاست و روانی ان کے ماحول کا نتیجہ تھی۔

سرسید کی نگاہ بہت دور رس تھی۔ دماغ بھی نکتہ رس ملا تھا۔ ان ہی خوبیوں نے انھیں ایک جادو بیان مقرر بنا دیا تھا۔ وہ ہر چیز کے روشن و تاریک پہلوؤں پر غور کرنے کے عادی تھے اور بہت آسانی سے وہ لطیف اور پوشیدہ باتیں معلوم کر لیتے تھے جن تک دوسروں کو غور و خوض کے بعد بھی رسائی نہیں ہوتی۔ نواب محسن الملک نے نہایت احترام و عزت سے اُن کی یوں تعریف کی ہے۔

"میرے پیر سرسید جو مرادف ہے مرشد کا ہادی، اس نے اس خوبی سے نہ صرف فصاحت و بلاغت بلکہ نہایت ہی عمدہ دلیلوں سے جو دوسری قوموں کو

کپکپا دینے والی ہیں یونیورسٹی میں فارسی زبان کی ضرورت کو ثابت کر دیا ہے۔"

ان کی تقریروں میں علمی، ادبی، تحقیقی، تعلیمی اور اصلاحی، غرض ہر قسم کے عنوان شامل ہیں لیکن کسی عنوان پر تقریر کرنے کے لئے کسی خاص تیاری کی انھیں ضرورت نہیں ہوتی تھی بلکہ فی البدیہ تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے یہی وجہ تھی کہ اُن کی تقریر میں جوش و خروش اور اصلیت پائی جاتی ہے۔ ایک جگہ کرنل گرہم لکھتے ہیں "جب وہ اپنے خاص مقصد کے تحت جوش میں بھری ہوئی تقریر کرتے ہیں تو ان کی طرز تقریر پر مسٹر گلیڈسٹین کا دھوکہ ہوتا ہے اس جوش کے ضبط کرنے کی کوشش میں ہونٹ کانپنے لگتے ہیں، آواز دردناک ہو جاتی ہے اور چہرہ متغیر، یہ تمام درد و غم کی علامتیں سامعین پر بجلی کا اثر کرتی ہیں۔"

سرسید کی آواز تقریر کے لئے نہایت موزوں ملی تھی اور وہ جب کبھی تقریر کرتے تو سامعین پر ایک سکتہ سا طاری ہو جاتا اور سارا ایوان گونج اٹھتا تھا اُن کی تقریر میں انتہا درجہ کی دل کشی تھی۔ اسی وجہ سے لوگ دور دراز سے اُن کی تقریر سننے کے شوق میں چلے آتے تھے۔ ان کی اس جادو بیانی کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے۔

"سرسید نے راجہ دھیان سنگھ کے دیوان خانے میں جو تقریر کی تھی اور جہاں ہزاروں کے مجمع پر ایک سکتہ طاری ہو گیا تھا اور کوئی مسلمان ایسا نہ تھا جو زار و قطار نہ روتا ہو۔"

سرسید ایک زبردست شخصیت کے حامل تھے اُنھیں ڈاکٹر نذیر احمد، نواب محسن الملک اور حالی جیسے سرگرم کارکن میسر آئے اُن کے اخلاق نہایت ارفع و اعلیٰ

تھے اور اس سے ان کے ہمدموں اور ہمنشینوں پر اثر پڑتا رہا یہی وہ خوبیاں تھیں جن کے باعث وہ اپنے وقت کے بہترین مقرر اور رہنما سمجھے جاتے تھے۔

نواب محسن الملک

سید مہدی علی خاں محسن الملک ہندوستان کے اُن نامور مقررین میں سے تھے جن کی کوششیں قومی فلاح وبہبود کے لئے وقف تھیں۔ وہ ایک فصیح وبلیغ مقرر ہی نہیں تھے بلکہ سرسید مرحوم کے اُن مددگاروں میں تھے جنھوں نے اصلاح معاشرت کی بنیادیں رکھیں۔ اُنھیں خطابت میں غیر معمولی کمال تھا۔ جس طرح وہ بےمثیل تحریری صلاحیت کے مالک تھے اُسی طرح قوت گویائی بھی بے پناہ رکھتے تھے۔ ان کی تقریر کا ہر لفظ ایک قیمتی گوہر تھا۔ آج بھی حیدرآباد و شمالی ہند کے اُن بزرگوں کو جنھوں نے محسن الملک کی تقریریں سنی ہیں نواب بہادر یار جنگ کی تقریر پر اس طرح رائے زنی کرتے ہوئے پاتے ہیں کہ محسن الملک کے بعد بہادر جنگ کی تقریر میں جوش وخروش، سوز وگداز اور اثر پیدا کرنے کے کمالات دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محسن الملک ایک زبردست مقرر تھے۔ یہی وجہ تھی کہ کوئی جلسہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں محسن الملک کی شرکت لازمی نہ قرار دی جاتی۔ چنانچہ مدرسۃ العلوم اور محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسوں کی رونق انہی کے دم قدم سے قائم تھی، ایک جگہ سرسید اپنے خط میں محسن الملک کی تقریر کو اس طرح سراہا ہے کہ "ہمارے محبوب مہدی علی اور ہمارے عزیز مشتاق حسین کا حال سنو۔ یہ ہمارے دونوں دوست ایسے ہیں جن کا حال چھپا نہیں ہے۔ مولوی مہدی علی کا علم اس کی ذاتی خوبیاں اور پیاری پیاری باتیں اور اس کی سچی ایمانداری، اس کی فصیح وبلیغ تقریر اس

قابل ہے کہ اگر ہماری قوم کی آنکھیں اندھی نہ ہوتیں تو اس کے نام پر فخر کیا کرتیں۔

نواب محسن الملک کو مطالعہ کا ازحد شوق تھا۔ ان کی معلومات بہت وسیع تھیں۔ اُن کی آواز بلند اور شیریں تھی اور جب کبھی مجمع کو مخاطب کرتے تو ایک رعب طاری ہو جاتا۔ ان میں بہ حیثیت مقرر یوں تو بہت سی خوبیاں تھیں لیکن ان کی خطابت کا نمایاں کمال یہ تھا کہ وہ وقت کے ہاتھوں مجبور نہ تھے بلکہ وقت کو اپنے قبضۂ قدرت میں رکھتے تھے۔ جب وہ تقریر ختم کرنے کے قریب ہوتے اور اُن سے یہ کہہ دیا جاتا کہ ان کے لئے زیادہ وقت دیا جا رہا ہے تو وہ تقریر کو کچھ اس انداز سے پھیلاتے تھے کہ سامعین کو یہ محسوس بھی نہ ہوتا کہ وہ تقریر ختم کرنے والے تھے اور مجبوراً طول دیا ہے۔ بلکہ ہر ایک یہ باور کرنے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ اُن کی کہی ہوئی ساری باتیں ضروری اور تقریر کی جان تھیں اور اس کے برعکس اگر ایسے وقت میں بھی جب کہ وہ تقریر کو پھیلا رہے ہوں اور اس مقام پر بھی جس کو تقریر کا اُٹھان کہتے ہیں۔ ان سے تقریر ختم کرنے کی خواہش کی جاتی تو اس خوبی سے تقریر کو اختتام پر پہنچاتے کہ گویا انھیں اُس سے زیادہ کچھ کہنا ہی مقصود نہ تھا۔

سرسید کی طرح اُن کی تقریروں کے ہر لفظ سے صداقت و خلوص ٹپکتا ہے سرسید کو محسن الملک جیسا حامی و مددگار ملا، جس نے مدرسۃ العلوم کو اُن کے بعد بھی ایسی حالت میں جب کہ وہ قرض کے بار سے دبا جا رہا تھا ترقی دی اور سرسید کی ساری جانفشانی و محنت کو رائگاں جانے سے بچا لیا۔

نواب محسن الملک کی تقریریں مجموعۂ "لکچرز و اسپیچز" کے نام سے محفوظ کر لی گئی ہیں۔ ان کی تقریروں میں صدارتی تقریریں بہت زیادہ ہیں جس سے معلوم ہوتا

ہے کہ وہ اکثر محفلوں کے صدر نشین رہا کرتے تھے۔ محسن الملک کو یہ پسند نہ تھا کہ تقریریں قبل از وقت مرتب کر لی جائیں بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ انسان کے سچے جذبات کا اندازہ صرف فی البدیہ تقریروں سے ہی لگایا جاسکتا ہے۔ اسی وجہ سے وہ فی البدیہ تقریر کرنے کے بہت بڑے حامی تھے۔

ڈاکٹر نذیر احمد

ڈاکٹر نذیر احمد اُردو کے بے پناہ اور بلند پایہ مقرر تھے۔ تقریر میں سرسید کا اسلوب بیان اور سادگی پائی جاتی تھی۔ ابتدائی زمانہ میں اُنھیں خود خبر نہ تھی کہ وہ اچھے ادیب ہونے کے علاوہ ایک بہترین مقرر بھی ہیں۔ جب انھیں ایک دو مرتبہ کے تجربہ سے اپنی تقریری صلاحیت کا اندازہ ہوا تو وہ جھجکے بغیر تقریر کرنے لگے اور اُن میں ایسی خود اعتمادی پیدا ہوگئی کہ وہ فن تقریر کے بھی ماہر ثابت ہوئے مولانا نذیر احمد کے الفاظ میں ایک خاص اثر تھا جس کے ساتھ آواز بھی موزوں ملی تھی۔ جب کبھی یہ تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوتے تو مجمع خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو ہر شخص اُن کی آواز یکساں سن سکتا تھا۔ ان کا طرز بیان اور طریقہ استدلال اتنا واضح اور عام فہم ہوتا تھا کہ ہر معمولی سی فہم کا آدمی بھی بغیر کسی دشواری کے مفہوم سمجھ سکتا تھا اور اس کے دل میں وہ خیال بہت ہی اچھی طرح جاگزیں ہوتا تھا۔ کیونکہ اُن کی تقریر کے ہر لفظ سے ادعاء و تحکم کا اظہار ہوتا تھا اور جو چیز بھی بیان کرتے تو اس قوت و زور کے ساتھ کہ وہ ان کا ایمان اور عقیدہ ہے اور اس کے برخلاف جو بھی چیز ہو وہ باطل و جھوٹ ہے۔ اس کے ساتھ انھیں اپنے دلائل پیش کرتے وقت کبھی یہ خیال نہیں گزرتا تھا کہ کوئی ان کی دلیل کو بے وزن ثابت کرے گا۔ اسی دلیری و خود اعتمادی نے سامعین پر اثر ڈالنے میں ہمیشہ اُن کی مدد کی۔

ڈاکٹر نذیر احمد اُردو کے ایک بلند پایہ ادیب تھے۔ ان کی نہ صرف

ہندوستان ہی میں قدر کی گئی بلکہ باہر والوں نے بھی ان کی خدمت میں خراج تحسین پیش کیا اور بعض کتابوں کے دوسری زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے۔ انھیں ادب پر بہت کافی عبور حاصل تھا۔ ان کی تحریر میں جو مزاح وظرافت کی چاشنی ہوا کرتی تھی وہی تقریر کی بھی وجہ امتیاز رہی۔ ایک جگہ وہ نیشنل کانگریس کی مخالفت کرتے ہوئے کہتے ہیں "نیشنل کانگریس کو اگر اندر سبھا کی قسم کا کوئی تماشا سمجھے۔ ابھی تھوڑی دیر میں آپ لوگوں پر ثابت کردوں گا کہ اندر سبھا کی قسم کا نہیں تو نیشنل کانگریس تماشا ضرور ہے۔"

انھیں سائنس، فلسفہ وغیرہ سے بھی خاصی واقفیت تھی جس کی مدد سے انھوں نے اپنی تقریر میں اثر پیدا کرنے کی کوشش کی۔

ہر بات کو کسی نہ کسی مثال کے ذریعہ واضح کرنے کے عادی تھے چنانچہ وہ ایک جگہ قوم کی ترقی وزوال کے اسباب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں "اگر ایک پتھر اوپر کی طرف پھینکا جائے تو وہ پھینکنے والے کی قوت سے ایک حد تک اونچا جائے گا لیکن اس کا اونچا جانا ہی اس کے گرنے کی دلیل ہے ؎

یہ قامت ہمیں پیغام سفر دیتی ہے زندگی موت کے آنے کی خبر دیتی ہے

اونچا چڑھنے میں پتھر کی رفتار ابتداءً فاسٹ (تیز) ہوتی ہے پھر بتدریج دھیمی اور مدھم ہوتے ہوتے آخر کار فنا ہوجاتی ہے۔ اے کاش! رفتار صعودی کے فنا ہونے سے پتھر کو سکون اور وقوف حاصل ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہوسکتا گراویٹیشن کے قاعدے سے ضرور ہے کہ پتھر جیسا اونچا چڑھتا تھا ویسا ہی نیچے کو گرے، صعود و ہبوط حرکتیں دونوں میں اگر فرق ہے تو صرف اس قدر کہ حرکت صعودی کی ابتداء

فاسٹ (تیز) اور انتہا سلو (آہستہ) ہوتی ہے اور حرکت ہبوطی کی بالعکس یعنی ابتدا بطی اور انتہا سریع۔ مجھے یاد نہیں مگر اتنا خیال ضرور ہے کہ حرکت صعودی جس نسبت سے سُست اور حرکت ہبوطی جس نسبت سے تیز ہوتی جاتی ہے۔ ہندسہ دانوں نے تحقیق کرکے اعداد میں اس کا ٹھیک اندازہ ٹھیرا دیا ہے جس کو شوق ہو (اور وہ اس وقت کے مسلمانوں کو نہ ہوا ہے اور نہ ہوتا ہے) ہمارے شمس العلماء خان بہادر مولوی ذکاء اللہ صاحب سے معلوم کرسکتا ہے۔

پتھر کے صعود اور ہبوط پر ہم قومی ترقی و تنزل کو قیاس کرسکتے ہیں اور اسی لئے میں نے اس کا تذکرہ کیا ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ ریاضی کا مسئلہ۔"

نذیر احمد کی تاریخی معلومات بہت وسیع تھیں۔ اُن کی تقریروں میں تاریخی واقعات کثرت سے نظر آتے ہیں اور خاص طور پر انھوں نے تاریخ اسلام کی خوشہ چینی کی ہے۔ چونکہ وہ سرسیّد کے ساتھیوں میں سے تھے جن کے پیش نظر مسلمانوں کی بہتری و فلاح تھی اس لئے ان کو اُکسانے کے لئے ان کی قومی تاریخ کے واقعات پیش کرنا زیادہ مفید ہوسکتا تھا۔

مولینا انگریزی الفاظ استعمال کرنے کے بڑے عادی تھے اور اس بے تکلفانہ انداز میں گویا اُردو زبان ہی کا کوئی لفظ ہے۔ وہ اگر چاہتے تو ان الفاظ کی جگہ اردو زبان کے لفظوں کو دی جاتی لیکن وہ اپنے ماحول کے اقتضاء سے مجبور تھے

ڈاکٹر نذیر احمد کی تقریروں کی مقبولیت اور جادو بیانی و سحر طرازی کے اثر سے مدرسۃ العلوم کو کامیاب بنانے میں بڑی مدد ملی۔ اُن کے جیسے سرفروش اور پُرجوش مقرر میسر نہ آتے تو شاید سرسیّد کو اس قدر کامیابی حاصل نہ ہوتی۔ ان کی

تقریروں کا مجموعہ ان کے فرزند مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے مرتب کیا ہے۔ وہ اپنے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ "سرسید نہایت تمنا اور آرزوں سے مرحوم کو اپنے ساتھ لئے پھرتے تھے۔ انجمن حمایت الاسلام کے سکریٹری خود ہر سال دہلی آکر خواہ وہ کسی حالت میں ہوں منت، سماجت، اصرار اور استبداد سے اُن کو لے جاتے" آگے لکھتے ہیں۔ "وہ آڈینس میں ایک سمرک اثر پیدا کرتے تھے۔ ایڈینس کے کان اور دل اُن کی مٹھی میں ہوتے تھے۔ کبھی ان کو ہنساتے تھے تو ایسا کہ پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے اور کبھی رلانے پر آتے تو ہچکیاں لگ جاتی تھیں اور لوگ بے اختیار ہو جاتے اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگتے اُن کے لکچر کے دن پنڈال کھچا کھچ بھر جاتا تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔ جب تک تقریر کرتے رہتے تھے لوگ ہمہ تن گوش ہو جاتے تھے اور ایسا عالم سکوت رہتا تھا کہ گویا منہ میں زبان نہیں طرز بیان، حرکات و سکنات سب ایک سے ایک بڑھ چڑھ کے تھے۔ آواز ایسی خداداد کہ گویا شیر کی ڈکار، صورت، شکل، جسامت، قد و قامت، سب باوقار سرسید کی وفات مسلمانوں کی موت تھی یہ سب مسلم مشینری کے کل پرزے تھے اور وہ اسٹیم۔ سرسید کا دم آخریں اس مشین کو مفلوج کر گیا اور ڈاکٹر نذیر احمد کی لکچر بازی ختم ہوئی۔ خود نے کہا ہے ؎

کیا کہیں مشغلہ لکچر کا اجی چھوٹ گیا + ہم سے ایک یار چھٹا ایسا کہ جی چھوٹ گیا
صبر رخصت ہوا سنتے ہی تیرا عزم سفر + تم تو کل جاؤ گے یہ ہم سے ابھی چھوٹ گیا

نواب محسن الملک بہادر سرسید کے سچے جانشیں تھے اور اُن کا ڈاکٹر نذیر احمد سے خوب یارانہ تھا۔ جب سرسید دُنیا سے اُٹھ گئے تو انھوں نے

محسن الملک کی خاطر تقریریں کیں لیکن چار و ناچار اور مروّت کو ملحوظ رکھ کر کیں
سچ یہ ہے کہ اُن کی تقریروں کی گرم بازاری دراصل سرسیّد کی ذات
سے وابستہ تھی جو اُن کے بعد ختم ہو گئی۔

عزیز مرزا

عزیز مرزا مرحوم اُن خدا ترس لوگوں میں سے تھے جن کی ذات سے ہزاروں انسانوں کی فلاح وبہبود وابستہ تھی۔ یہ اعلیٰ مدبر سلطنت بھی تھے اور اس کے ساتھ ہی اُن کا ذوقِ ادب بھی بہت بلند تھا اُنھیں ملکی وسیاسی خدمات کے باعث جو شہرت حاصل ہوئی اس میں ان کی جادو بیانی اور انشا پردازی کو خاصا دخل تھا۔ جب علی گڈھ کالج قائم کیا گیا تو یہ اس کے پہلے طلبہ میں داخل تھے اور اس وقت ان کی عمر دس برس کی تھی۔ طالب علمی کی زندگی میں استقلال اور پورے شوق سے محنت کرکے امتیاز کے ساتھ بی۔ اے کا امتحان کامیاب کیا۔ اس کے بعد یہ حیدرآباد میں ایک معمولی خدمت پر مقرر کئے گئے۔ لیکن اپنی خداداد قابلیت اور استعداد کی بدولت تھوڑے عرصے میں ہوم سکریٹری کی معزز اور اہم خدمت پر مامور کئے گئے اور کچھ عرصے کے بعد عدالت العالیہ کی رکنیت پر فائز ہوئے انھوں نے حیدرآباد کی بہت ہی ٹھوس اور نمایاں خدمات انجام دیں۔ خاص کر یہ یہاں کی علمی سرگرمیوں کی روح رواں تھے اور ان ہی کے دستِ گرہ کشا سے تعلیمی مسائل حل ہوتے تھے۔

ان کو ادب سے فطری لگاؤ تھا وہ اپنی طالب علمی ہی کے زمانے سے شعر وسخن کے دلدادہ تھے۔ تھوڑا بہت وقت شاعروں کی نغمہ سرائی میں ضرور صرف کرتے تھے اور مشہور مقررین میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جن کی تقریروں کا

اُنھوں نے دلچسپی اور انہماک سے مطالعہ نہ کیا ہو۔ اسی وجہ سے ان کی تقریر کا انداز بیان بہت سلجھا ہوا ہوتا تھا۔ ان کی تقریر ایک خاموش دریا ہوتی تھی۔ جس میں جہاں کہیں موڑ آجائے تو تیزی پیدا ہوجاتی ہے اور اُس کے ساتھ ہی کناروں کے کھیت بھی سیراب ہوتے ہیں۔ یہ سلاست و روانی اور سلجھا ہوا انداز بیان دراصل اُن کی مضمون نگاری کا ثمرہ تھا۔ چنانچہ کونٹیلین نے تحریری مشق کی نہایت ہی شدّ و مد کے ساتھ تاکید کی ہے اور سسرو جو رومہ کا بہت زبردست مقرر گزرا ہے۔ قلم کو فصاحت کا صانع اور معلم قرار دیتا ہے۔ وہ تمام خوبیاں جو ایک ایسے مقرر میں ہونی چاہیں جس کو زبان کے علاوہ قلم پر بھی دسترس حاصل ہو۔ مولوی عزیز مرزا کی تقریر میں موجود تھیں۔

حیدرآباد کی علمی، ادبی اور سیاسی سرگرمیوں کا سنگ بنیاد دراصل عزیز مرزا ہی کے ہاتھوں رکھا گیا تھا۔ آج جو چہل پہل اور چہ چا سنائی دیتا ہے۔ وہ عزیز مرزا مرحوم ہی کی محنتوں کا نتیجہ ہے۔ ان کے ہاتھوں جن اداروں کی بنیادیں رکھی گئیں وہ آج نہایت خوش اسلوبی سے سرگرم عمل ہیں جن سے تمام ملک بلاکسی لحاظ کے مستفید ہورہا ہے۔

مولنا کی تقریر اس قدر سنجیدہ اور لطافت زبان سے پر ہوتی تھی کہ آج بھی ان کو پڑھنے کے بعد بے اختیار سر دھنے کو جی چاہتا ہے اور تعجب ہوتا ہے کہ ایک ایسا مدبر جس کی تمام زندگی ملک کی سیاسیات کو سلجھانے میں گذری ہو۔ کیونکر لطیف انداز بیان میں تقریر کرنے کے قابل ہوسکتا ہے۔ اُن کی زبان میں عصری رجحانات اور تحریکات کا پورا اثر دکھائی دیتا ہے۔ یہ زبان کی مسئلہ میں بہت

وسیع نظر رکھتے تھے۔ اُنھوں نے جن مؤثر اور وزن رکھنے والی دلیلوں سے اُردو زبان سے متعلق جو عام طور پر بدگمانی پھیلی ہوئی تھی اسے دور کرنے کی کوشش کی ہے ان کی تقریری صلاحیتوں کی آئینہ دار ہیں۔ وہ ایک جگہ فرماتے ہیں:۔

"یہ امر محتاج بیان نہیں کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جو قومیں آکر آباد ہوئیں اُن کی مادری زبان زیادہ تر فارسی تھی اور اُردو زبان کی بنیاد اسی وجہ سے پڑی کہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے اور ہندوؤں کو مسلمانوں سے تبادلۂ خیالات کی ضرورت تھی اور چونکہ تعداد کے لحاظ سے غالب گروہ ہندو تھا اس لئے مشترکہ زبان کی بنیاد ہندی ہی پر رکھی گئی اور اس پر عربی اور فارسی کے قصر و ایوان تعمیر ہوئے پس اُردو کی نسبت یہ کہنا کہ یہ خاص مسلمانوں کی زبان ہے انصاف کا سراسر خون ہے حقیقت حال یہ ہے کہ یہ مشترکہ زبان ہے اور اس کو ہندوؤں کی زبان ہونے کا بھی اسی طرح فخر حاصل ہے جس طرح مسلمانوں کی مادری زبان ہونے کا۔"

عزیز مرزا مرحوم نے آج سے ایک عرصہ پہلے جو بات کہی تھی آج بھی ہر صاحب نظر اور بے تعصب انسان اس کی صداقت کی گواہی دیتا ہے۔ وہ بہت ہی بے تعصب حق پرست تھے اس لئے وہ بے جا رواداری کے روادار نہیں تھے۔

ان کی تقریروں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غیر معمولی معلومات کے انسان تھے۔ اور زیادہ سے زیادہ معلومات کو سلجھے ہوئے انداز میں اس طرح پیش کرنا کہ سامعین پر بار نہ ہوں اُن کا ہی حصہ تھا، تاریخ کا بھی بہت ہی دقیق نظر سے مطالعہ کرتے تھے۔ خاص طور پر اُنھوں نے دکن کی تاریخ کو اس گہری نظر سے دیکھا تھا کہ یہاں کی قومی اور سماجی زندگی کی سنوار میں اُنھیں اپنی تاریخ بینی سے بے انتہا

فائدہ پہنچا اور جو کام دوسروں سے بن نہ پڑے انھوں نے ان دشوار اور سخت مشکل کاموں کو بڑی آسانی سے سرانجام دیا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ جب تک وہ ہر کام کے لئے ایک مکمل خاکہ تیار کر کے اس کے تمام پہلوؤں پر غور نہ کر لیتے قدم نہیں اُٹھاتے تھے۔

یہی خصوصیت ان کی کامیابی کی ضامن تھی۔ خدا نے اُن کو قومی درد دیا تھا اور ہندوستان کی بدلتی ہوئی سیاست اس کی متقاضی تھی کہ عزیز مرزا جیسا سرگرم اور مستقل مزاج معتمد مسلم لیگ کے لئے منتخب کیا جاتا۔ چنانچہ ان کی زندگی کا آخری زمانہ اسی خدمت کو انجام دینے میں گزرا۔

مولانا محمد علی

سرسید کے بعد نواب محسن الملک ان کے نقش قدم پر چل کر قومی معاملات کو سلجھاتے رہے لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد حکومت کی حکمت عملی میں نمایاں تبدیلی ہو گئی جس کے اثرات مسلمانوں پر بہت زیادہ پڑے اور ان کے احساسات وجذبات میں غیر معمولی تموج پیدا ہوا۔ اس ہیجان و بے چینی کے عالم میں ہر شخص نے اپنی بساط بھر قومی خدمت انجام دی لیکن ان انفرادی کوششوں میں مرکزیت پیدا کرنی ضروری تھی۔ اس کام کو مولانا محمد علی نے اپنے ذمے لیا اور خدا نے اُن کی ذات میں جو صلاحیتیں ودیعت کی تھیں ان کی بدولت انھیں اپنے مقصد میں نمایاں کامیابی ہوئی جس کا اُن کے مخالف اور موافق دونوں اعتراف کرتے ہیں۔

علی گڈھ کالج کے بانی کی مسلسل کوششوں سے انگریزی تعلیم کی مخالفت کا زور کم ہوا اور اکثر شرفاء تعلیم کی غرض سے اپنے بچوں کو علی گڑھ بھیجنے لگے اور چند سالوں میں علی گڈھ کالج نے ہر مسابقت کے میدان میں دوسرے پر سبقت حاصل کی۔ کھیلوں میں علی گڈھ والوں کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی اور انگریزی تقریر و تحریر میں بھی اُنھیں کمال حاصل تھا۔ یہ فضا تھی جس میں علی برادران کی نشو و نما ہوئی اور تھوڑے عرصے بعد یہ دونوں بھائی علی گڈھ پر چھا گئے۔ مولانا شوکت علی نے کھیل کے میدان میں شہرت پائی اور مولانا محمد علی نے (یونین) انجمن میں تیغ زبان کے جوہر دکھائے اور تحریر و تقریر میں جو اُنھیں یکساں ملکہ حاصل تھا اس کے باعث انھوں نے اپنی فصاحت

وبلاغت کا سکہ بٹھا دیا۔

طالب علمی کے زمانے میں اُن کی تقریریں سن کر اکثر انگریز پروفیسر دنگ رہ جاتے تھے یہ اپنی تحریر و تقریر میں بہت ہی بے باک اور نڈر واقع ہوئے تھے۔ اکثر اسی آزادیٔ رائے کے باعث اساتذہ کو اُن سے اختلاف رہتا تھا۔ سلاست زبان کے ساتھ قدرت نے بذلہ سنجی اور شگفتگی کا جوہر بھی عطا کیا تھا۔

مولانا محمد علی نے جب عملی زندگی میں قدم رکھا تو اُن کی یہ خصوصیت ہمیشہ ان کا طرۂ امتیاز رہی اور کامریڈ کے جاری ہوتے ہی تاڑنے والوں نے تاڑ لیا کہ ایک دن محمد علی ہندوستان کی قیادت حاصل کریں گے۔

مولانا کی ذات میں خاص رعب و دبدبہ اور شاہانہ وقار تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اُن کی قیادت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے:۔

"میں اس بہادر لیڈر کا بہت زیادہ احترام کرتا ہوں اس نے آزادی کی جدوجہد میں جو قربانیاں کی ہیں اور جو کام سر انجام دئے ہیں وہ تاریخ آزادی میں جلی حروف سے لکھا جائے گا اور سب سے نمایاں جگہ پائے گا۔"

مولانا کو غیر معمولی ذہانت اور فہم و تدبر عطا ہوا تھا اور پھر ان صلاحیتوں میں ترقی دینے کے لئے وہ دوسرے ذریعوں سے بھی برابر مدد لیتے تھے۔ اُن کی طبیعت میں تحقیق و جستجو کا ذوق تھا۔ تاوقتیکہ کسی مسئلہ پر کافی غور و خوض نہ کرتے اور تلاش و جستجو سے اس سے متعلق بہت کچھ معلومات حاصل نہ کر لیتے کوئی رائے ظاہر نہ کرتے تھے۔ اور جب کسی مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کر لیتے تو انھیں کسی مخالفت کی پروا نہ ہوتی تھی۔ وہ نہایت ہی بے باک اور راست گو واقع ہوئے تھے۔ جس بات کو وہ

حق سمجھتے تھے اس کے ظاہر کرنے میں ہرگز پس وپیش نہ کرتے تھے۔ اکثر قائدین ایسے مجمع میں بہت گھبراتے ہیں جہاں اکثریت اُن کی مخالف ہو۔ رائے عامہ کے سیلاب کے ساتھ رہنا تو بہت آسان ہے لیکن اس سیلاب کے رُخ کو بدلنا سخت مشکل کام ہے لیکن مولانا محمد علی کی ذات میں ایسا اثر ونفوذ تھا کہ وہ بڑے سے بڑے اور مشتعل مجمع پر بھی قابو حاصل کر لیتے تھے۔ خواہ وہ مجمع ہندوستان کے عوام کا ہو یا انگلستان کے دار الامراء یا دار العوام کا۔ مولانا نے ابن سعود کو بھی ان کے منہ پر وہ کھری کھری سنائی کہ سب دنگ رہ گئے۔

مولانا کی سی جامع شخصیت کا شاید ہی کوئی قائد ہندوستان کی سرزمین میں پیدا ہوا ہو۔ وہ اسلام کے شیدائی بھی تھے اور قوم پرست بھی وہ اردو اور انگریزی کے مقرر بھی تھے اور اس کے ساتھ ہی شاعری میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔

مولانا محمد علی، اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے زبردست مقرر تھے زبان کی سلاست، روانی، خیالات کا زور، جوش اور سچے قومی جذبات کا بے باکانہ اظہار، ان کی تقریر کے سب سے نمایاں عناصر تھے اس کے ساتھ ہی دلیلیں نہایت واضح اور عام فہم ہوتی تھیں۔ اُن کی تقریر بصیرت افزا، اور ایمان افروز ہوتی تھی۔ ان کی تقریروں میں جوش عمل کا ایسا دلپذیر عنصر ہوتا تھا کہ سامعین والہانہ جذبہ کے ساتھ آمادۂ عمل ہو جاتے تھے۔ تقریر میں درد و اثر تھا۔ کیونکہ ان سے زیادہ قوم کی تباہیوں سے کوئی واقف نہ تھا اس کے ساتھ ہی وہ ایک نرم ونازک دل بھی رکھتے تھے۔ ہر جمعہ کی نماز کے بعد تقریر کرنے کے عادی تھے۔ چونکہ خود بہت نرم دل واقع ہوئے تھے۔ اس لئے اکثر تقریر کے دوران میں جب قوم کی

تباہیوں کا ذکر آجاتا تو اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک پیہم دریا جاری ہو جاتا تھا اور اس سے مجمع پر بھی ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

ایک انگریز مصنف نے مولنا کی تحریر کو مکالمے کی تحریر، تقریر کو برک کی زبان آوری اور اُن کے عزم و استقلال کو نپولین کے آہنی ارادوں کے برابر بتایا ہے۔

انگلستان کی مزدور کانفرنس میں مولنا نے شرکت کی اور بہت کچھ کد و کاوش کے بعد مسٹر جارج کی کوششوں سے انھیں پانچ منٹ تقریر کرنے کی اجازت مل گئی مولنا نے اس جلسے میں اس بے باکی اور مؤثر انداز میں تقریر کی کہ صدر کے کئی بار گھنٹی بجانے کے باوجود لوگ اصرار کرتے رہے کہ مولنا کو اور تقریر کرنے کا موقع دیا جائے۔ حتیٰ کہ مولنا نے تقریباً کوئی آدھا گھنٹہ تقریر کی۔ اب ہم ذیل میں مولنا کی اہم تقریروں کا ذکر کرتے ہیں جو انھوں نے ہندوستان اور بیرون ہند کی ہیں

خلافت کی تحریک ایک بالکل مذہبی تحریک تھی۔ اس سے بعض لوگوں کو بدگمانی پیدا ہو گئی تھی کہ مولنا اور ان کے ساتھی ملکی مفاد کا کوئی لحاظ نہیں کرتے اس زمانے میں افغانستان کے حملہ کی افواہیں بھی گشت لگا رہی تھیں۔ مولنا ان شکوک کو دور کرنے کے لئے مدراس کے مقام پر جو تقریر کی تھی اس کے ہر لفظ سے اُن کی حب الوطنی ٹپکتی ہے۔

"اگر کوئی غیر ملکی طاقت خواہ وہ جرمنی ہو یا روس، ترکی ہو یا افغانستان ہمارے ملک پر حملہ کرے گی تو ہم سب سے پہلے اپنے ملک کی حفاظت میں جان دیں گے۔ ہم ایک دفعہ غلام بنائے جا چکے ہیں اب دوبارہ غلام بننے کی خواہش نہیں ہے۔"

مولانا کی وہ آخری تقریر جو انھوں نے گول میز کانفرنس میں کی تھی اور جس نے دونوں ملکوں کو ہلا دیا تھا ہمیشہ یادگار رہے گی۔ اس تقریر کی اثر پذیری وسحر کاری، زبان کی سلاست و روانی کی تعریف میں انگلستان اور ہندوستان کے اخباروں نے کئی کالم بھر دیئے تھے اور ہر شخص ان کی مدح کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

ہم اس تاریخی تقریر کا ایک حصہ نقل کرتے ہیں جو ہندوستان کی قومی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

"میں آپ سے درجۂ مستعمرات لینے نہیں آیا بلکہ میں مکمل آزادی کے عقیدے کا پابند ہوں میں آج جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں وہ یہی ہے کہ میں اپنے ملک کو واپس جاؤں تو آزادی کا منشور میرے ہاتھ میں ہو..... اگر آپ مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دیں گے تو پھر یہاں میرے لئے ایک قبر کی جگہ دینی پڑے گی"

نقاد، ادیب اور شاعر ہونے کی حیثیت سے مولانا کی تقریر میں ضروری مسائل اور اُن کی تفہیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ قسم کی ادبیت بھی رہتی تھی۔ جب اس میں ان کی فطری بذلہ سنجی کی بھی چھیڑ ہوتی تو تقریر میں جادو کا سا اثر پیدا ہو جاتا تھا۔

عطاء اللہ شاہ بخاری

آپ پنجاب کے بہت مشہور خطیب ہیں آپ کی تقریر کیا سحر و اعجاز کا ایک کرشمہ ہوتی ہے اور جب کبھی بولنے پر آتے ہیں تو سارا مجمع اُن کی مٹھی میں ہو جاتا ہے۔ اور وہ ایسا محو سماعت ہوتا ہے کہ اس سے قوت فیصلہ بالکل سلب ہو جاتی ہے۔ اگر یہ چاہیں تو زبردست سے زبردست غلطی کا بھی مجمع سے دوران تقریر میں ارتکاب کروا سکتے ہیں۔ یہ مسلسل کئی گھنٹوں تک تقریر جاری رکھتے ہیں لیکن مجمع اکتاتا نہیں کیونکہ یہ عوام کی نفسیات اور مذاق کے مطابق تقریر کرتے ہیں تقریر کو دلچسپ بنانے میں دو چیزوں سے خاص طور پر مدد لیتے ہیں۔ ایک تو کہاوتیں اور قصے سناتے ہیں اور دوسرے حرکات و سکنات سے بھی تقریر کی دلکشی بڑھاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تقریریں بہت زیادہ مقبول ہوئیں۔

مولانا محمد علی نے اُن کی تقریر پر نہایت ہی بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

"بھائی! میں تمہاری تقریر سے بہت خوش ہوں تم نے سامعین کو بالکل محو کر دیا تھا۔ اگر اس کے بعد تم ان سے کوئی غلط کام بھی کروانا چاہتے تو وہ فوراً کر دیتے جو قدرت تم کو اپنی زبان پر حاصل ہے وہ خداداد ہے اور خدا کی ایک بڑی نعمت ہے مگر بڑی خطرناک ہے اور تمہاری مقبولیت اس کے بعد اور بڑھ گئی جب تک تم اسے حق کی راہ میں استعمال کرو گے فلاح دارین حاصل کرو گے لیکن

اگر کبھی یہ باطل کی راہ میں استعمال کی گئی تو ہزاروں بندگانِ خدا کے گمراہ کرنے کے لئے بھی کافی ہوگی۔ لوگوں کو مسحور کر دینا اچھا نہیں۔ سحر کاری میں نہ ساحروں کے لئے نہ مسحوروں کے لئے فلاح ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہر مسئلہ کے دونوں پہلو سامعین کے سامنے پیش کرو اور انھیں سے اس کا حل اور فیصلہ کراؤ اس طرح تم عوام کی قوت فیصلہ کو ترقی دے سکو گے ورنہ عوام کالانعام مشہور ہیں۔ آج تم نے ظرافت کے باعث ان پر اثر قائم کیا کسی دوسرے کا جادو کل چل جائے گا اور اس طرح انھیں حق و باطل کی تمیز تا قیامت نہ آئے گی۔ کبھی تمھارے ساتھ ہوں گے کبھی تمھارے مخالفین کے آج تم کو تخت پر بٹھائیں گے کل تمھیں اُتار کر دوسرے کو سریر آرا بنا دیں گے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد

مولانا ابوکلام آزاد، ہندوستان کے سب سے زیادہ مشہور مقرر ہیں جن کی شہرت کے ڈنکے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر دور دور تک بج رہے ہیں اور آپ کی فصاحت و بلاغت سے ہندوستان کا ہر فرد واقف ہے۔ مولانا نے ملک و قوم کی ایک طویل مدت تک جو بے لوث خدمات انجام دی ہیں اور اپنی جادو بھری تقریروں سے آزادی کی جو روح پھونک دی ہے اس سے کون واقف نہیں ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ کی تحریری صلاحیتوں کا مظاہرہ الہلال اور البلاغ کے ذریعہ ہوتا رہا ہے جس سے ہندوستان نے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ ان تمام خوبیوں کے علاوہ مولانا کی ذات اپنے علمی تبحر کی بدولت بھی نہایت قابلِ احترام ہے۔

مولانا اپنے مسلک و رائے میں بہت زیادہ مستقل ہیں۔ شاید ہی کوئی مثال آپ کی زندگی میں ایسی ملے گی جو ان کے اس موقف کے خلاف ہو۔ یہی استقلال اور مسلک کی پابندی اُنکی تحریر و تقریر دونوں کی نمایاں خصوصیتیں ہیں۔

مولانا کا زورِ بیان اُن کی تقریر کی جان ہوتا ہے۔ مولانا کی تقریر میں سمندر کا سا تلاطم اور دریاؤں کی سی سیرابی موجود ہے۔ جب کوئی بات بیان کرتے ہیں تو اس دلکش اور مؤثر انداز میں کہ سامعین بے اختیار ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں ان کی تقریر کے متعلق بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ایک ناپیدا کنار سمندر ہے جس سے موتی نکال لانا ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ بلکہ یہ تو صرف بلند ظرف غواص ہی کا حصہ

ہے یہ خصوصیت آپ کے علمی تبحر کا لازمی نتیجہ ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تقریر نہایت درجہ پُرلطف اور واضح ہوتی ہے اور سامعین کے لئے کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہوتی۔

ایک ماہر خطابیات کا قول ہے کہ تقریر کے اثر کو زیادہ دیرپا اور مستحکم بنانے کے لئے اظہار خیال میں تکرار اور ندرت ضروری ہے۔ مولنا میں یہ خصوصیت بدرجہ اتم موجود ہے اور اس میں ان کی مستقل مزاجی کے باعث بہت تقویت پہنچتی ہے۔

مولنا کی طبیعت تشبیہ اور استعارے کی طرف بہت زیادہ مائل ہے جب کسی خیال کو پیش کرتے ہیں تو اس میں تشبیہ و استعارے ہی کی مدد سے زور آور اثر پیدا کرتے ہیں لیکن ان کی تشبیہیں اور تمثیلیں دور از فہم نہیں ہوتیں آپ کا یہ طریقہ غم والم اور نفرت کے جذبات اُکسانے میں بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

تقریر میں بہت زیادہ تسلسل ہوتا ہے۔ اور تاوقتیکہ پوری تقریر سنا نہ لیں دماغی الجھن دور نہیں ہوتی۔ اس لئے سامعین بے حد شوق سے آپ کی پوری تقریریں سنتے ہیں اور جب تقریر ختم ہو جاتی ہے تو پھر کسی قسم کا شبہ باقی نہیں رہتا۔

آپ ایک اچھے نفسیات دان بھی ہیں اور جب کوئی بات بیان کرتے ہیں تو وہ اپنی نفسیات دانی ہی کی روشنی میں بیان کرتے ہیں اس لئے سامعین کے دلوں پر بجلی کا سا اثر ہوتا ہے۔

مولنا کی تقریروں کی اب وہ گرم بازاری اور شہرت باقی نہیں رہی۔ اب جب ضرورت تقریریں کرتے ہیں۔

نواب بہادر یار جنگ بہادر

نواب صاحب عصر حاضرہ کے ایک نہایت ہی فصیح اور پر اثر مقرر ہیں جن کی قوتِ اظہار، سیاست دانی اور موجودہ طرز حکومت کے اثرات کی وضاحت بہت دل پذیر اور مشہور ہوگئی ہے۔ آپ کی ابتدائی تعلیم و تربیت حیدرآباد کے مشہور و معروف مدرسۂ دارالعلوم میں ہوئی اس مدرسے کی ایک بہت ہی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ ہمارے ملک کے اکثر مشاہیر اسی درس گاہ کے تعلیم یافتہ ہیں۔

آپ کی تقریری تربیت دوسرے طالب علموں کے ساتھ مدرسہ کی بزم مباحثہ میں ہوئی لیکن چونکہ آپ دوسروں کی نسبت بہت زیادہ تقریری صلاحیتوں کے مالک تھے اس لئے سب پر انھیں سبقت حاصل ہوئی اور تقریری مسابقت میں اوّل آنے کے صلہ میں طلائی تمغہ بھی حاصل کیا۔

نواب صاحب نے تعلیم ختم کرنے کے بعد ذاتی طور پر مذہبیات اور سیاسیات وغیرہ کا مطالعہ کیا اور اُن کی تقریر کے جوہر میلاد النبی کے جلسوں میں کھلے۔ ایک بار خسرو دکن بھی شریک محفل تھے۔ آپ نے نواب صاحب کی تقریر کو بے حد پسند فرمایا اور خطاب مرحمت فرمایا گیا۔

نواب صاحب ایک عرصے تک مذہبی تحریکوں کو روبہ عمل لانے میں سرگرم رہے لیکن بہت جلد انھیں سیاسیات کی طرف متوجہ ہونا پڑا اور اپنی خداداد قابلیت اور غیر معمولی صلاحیت کے باعث تھوڑے ہی عرصے میں منزل قیادت تک پہنچ گئے۔

اب آپ حیدرآباد کی سیاسی زندگی کی روح رواں ہیں۔

آپ کے رگ و ریشہ میں قوم و ملک کی محبت سمائی ہوئی ہے۔ جس کا ان کی تقریروں سے اظہار ہوتا رہتا ہے لیکن آپ عام مقرروں کی طرح قوم کی تباہیوں پر آنسو نہیں بہاتے بلکہ اس کی غیرت و حمیت کو اپنی جادو بھری تقریر سے بیدار کرتے ہیں کہ وہ دوسری قوموں کے دوش بدوش میدان ترقی میں گامزن ہو جائیں۔ آپ کی تقریر میں انتہا درجہ کے ترقی پسندانہ جذبات ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ایسا نوجوان تقریر کر رہا ہے جس کے سامنے ایک بلند مقصد ہے جس تک وہ اپنی قوم کو لے جانا چاہتا ہے آپ کی تمام تر امیدیں قوم کے نوجوانوں سے وابستہ ہیں۔ اس لئے ضعیفوں اور سن رسیدہ لوگوں سے کہیں زیادہ نوجوانوں کے لئے فکرمند رہتے ہیں۔ آپ کا یہ ایقان ہے کہ قوم میں انقلاب پیدا کرنے کے لئے نوجوان نسل ہی کی توانائیوں اور جوش و سرفروشی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اس لئے آپ نوجوانوں کو مصروف جد و جہد دیکھنا چاہتے ہیں اور ہر وقت انھیں زہریلے عناصر سے غیر متاثر رکھنے کی پوری سعی کرتے ہیں۔

نواب صاحب کی تقریروں میں مولنا ابوالکلام کا زور بیان، مولنا محمد علی کا طرز استدلال، اور عطاء اللہ شاہ بخاری کی دلکشی کا امتزاج ہے جن سے ایک انفرادیت پیدا ہو گئی ہے جو مبتدیوں کے لئے قابل تقلید ہے۔

زبان میں بلا کی سلاست و روانی ہے اپنی موزوں اور پُرتاثر آواز سے تقریر میں جان ڈال دیتے ہیں۔ فارسی اور عربی زبان کی چاشنی بھی اثر پذیری میں بڑی حد تک ممد و معاون ہوتی ہے۔

آپ اسلامی تاریخ، فلسفہ، منطق اور علم کلام سے بخوبی واقف ہیں اور اقتضائے زمانے نے آپ کو سیاست کی جدید تحریکات سے بھی کافی روشناس کر دیا ہے۔ ان تمام خوبیوں کے علاوہ ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ آپ کا خطاب دل سے ہوتا ہے اور ہر چیز کا فیصلہ دماغی پیچیدگیوں سے غیر متاثر رہ کر کرنا چاہتے ہیں۔

نواب صاحب کی تقریر بہت معلومات آفریں ہوتی ہے۔ لیکن اس قدر سلجھا ہوا اور دلکش انداز بیان ہوتا ہے کہ سامعین پر بار نہیں گزرتا اور وہ نہایت ہی شوق اور انہماک سے تقریریں سنتے ہیں۔

تقریریں سننے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ مضمون پر بہت کافی غور و فکر کرتے ہیں اور اس کے بعد ذہنی خاکہ تیار کر کے اسی کے مطابق تقریر کرتے ہیں جس کی وجہ سے تسلسل قائم رہتا ہے۔ ہر سرخی کے تحت کافی معلومات نہایت ہی پُرلطف انداز میں پیش کرتے ہیں اور تقریر کے اختتام پر وہ تمام سرخیاں بیان کرتے ہیں جن کی توضیح و تشریح آپ نے تقریر کے دوران میں کی تھی۔

خاکے کی رنگ آمیزی میں جہاں علمی اور ٹھوس معلومات سے مدد لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مثالیں اور اسی قسم کی دوسری ایسی باتیں بھی بیان کرتے ہیں جو عوام کے لئے دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے آپ کی تقریریں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور معمولی پڑھے لکھوں کے لئے مساوی دلچسپ ہوتی ہیں۔ آپ نہ تو کوئی بات ایسی کہتے ہیں جو عام لوگوں کے لئے بعید از فہم ہو اور نہ کسی ایسی چیز کا ہی تذکرہ کرتے ہیں جو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سنجیدہ لوگوں کے نزدیک قابل اعتراض قرار دی جائے۔

نواب صاحب بعض نہایت ہی اعلیٰ صفات کے حامل ہیں جس کے باعث

اُنھیں ملک وملت کی قیادت و رہبری میں غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے اُن کی اس کامیابی کا سب سے بڑا راز اُن کی شخصیت کی مقناطیسی کشش میں مضمر ہے جو دوسروں کو آپ کا گرویدہ بناتی ہے۔ قائد کی یہ خصوصیت خداداد ہوتی ہے اور اس کا بچپن ہی سے ظہور ہوتا ہے۔ یہ کام نواب صاحب کے سوانح نگار کا ہے کہ اُن کی اس قائدانہ خصوصیت کا کس طرح نشو و نما ہوا، بیان کرے لیکن اس قدر بیان کرنا نامناسب نہیں کہ طالب علمی ہی کے زمانے سے اپنے ساتھیوں کی رہبری کا آپ کو موقع ملتا رہا ہے۔

نواب صاحب کی شہرت، ان کی بے لوث خدمات اور پیہم سرگرمیوں کا پرتو ہے۔ جو انسان شہرت پسند ہوتا ہے اس سے شہرت کوسوں دور بھاگتی ہے اور اس کے برخلاف جس کو کام کا شوق ہوتا ہے۔ شہرت اس کے پاؤں چومتی ہے۔

نواب صاحب بہت زیادہ آزاد خیال اور ترقی پسند واقع ہوئے ہیں۔ حلم و بردباری کا یہ عالم ہے کہ سخت سے سخت تنقید کو بھی خندہ پیشانی سے سنتے ہیں اور اگر تنقید حقیقت پر مبنی ہو تو اسے قبول کرنے میں اُنھیں ہرگز عذر نہیں ہوتا۔

وہ ملک و قوم کے کاموں میں ذاتی اور معاشرتی وابستگیوں کی پروا نہیں کرتے۔ حق تو یہ ہے کہ ان کی دوستی اور مخالفت سب کچھ ملک وملت کی فلاح و بہبود پر منحصر ہوتی ہے۔ جو قوم کا دوست ہو وہ آپ کا بھی دوست ہے اور جو قوم کا دشمن ہو آپ کو بھی اس سے دشمنی ہوگی۔

آپ امیر خاندان کے فرد ہونے کے باوجود غریبوں کے سچے غمگسار ہیں۔ اس انسان دوستی اور صداقت پسندی کو آپ کی کامیابی میں بہت کچھ دخل ہے۔

انجمن

دستور

زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس میں اجتماع کی ضرورت نہیں ہوتی۔ عہد حاضر کے بہت سے مسائل ہیں جن پر غور و خوض کرنے کے لئے جلسے منعقد کئے جاتے ہیں۔ اور ہم تہذیب و تمدن کے ایسے دور سے گزر رہے ہیں جہاں ہر فعل صحت بخش طریقے پر انجام پانا چاہئے۔ اس لئے انجمنوں اور اس کے عہدہ داروں کے فرائض اور کارروائیوں کے طریقوں سے متعلق چند اہم امور بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ طلباء کی ابتداء ہی سے صحیح تربیت ہو سکے۔

کسی کام کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لئے سب سے پہلے چند قواعد بنا لینے پڑتے ہیں۔ جس طرح کسی ملک کا نظم و نسق تاوقتیکہ وہاں کا دستور مکمل نہ ہو بہتر نہیں بن سکتا۔ اسی طرح ہر انجمن کی کامیابی کا بھی تمام تر دار و مدار قواعد و ضوابط کی مناسب ترتیب و تدوین پر ہوتا ہے۔

دستور کی تدوین کے لئے ایک خاص مجلس مقرر کی جاتی ہے جس کو ایسی ہدایتیں دی جاتی ہیں جن کو پیش نظر رکھ کر وہ دستور تیار کرتی ہے۔ اس مجلس میں ایسے اراکین ہی شریک ہوتے ہیں جن کو قواعد و ضوابط کی ترتیب کا تجربہ حاصل ہو۔

دستور کے دو حصے ہوتے ہیں۔ پہلے حصے میں دستور کی اہم دفعات شامل ہوتی ہیں اور دوسرے حصے میں ذیلی امور کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

دستور کی تدوین و ترتیب کے وقت اس امر کا خاص طور پر لحاظ کیا جانا چاہئے کہ الفاظ مختصر واضح اور جامع ہوں اور ہمیشہ ایسے الفاظ کے استعمال سے احتراز کریں جن سے اشتباہ پایا جاتا ہے۔

بالعموم دستور حسب ذیل اجزا پر مشتمل ہوتا ہے لیکن بعض معمولی انجمنوں کے لئے اس قدر تفصیلی قواعد کی ضرورت نہیں ہوتی اور ان میں ذیلی قواعد بھی شریک نہیں کئے جاتے۔

(۱) نام انجمن (۲) اغراض و مقاصد (۳) رکنیت (۴) اراکین و عہدہ داران مجلس کے فرائض (۵) جلسے (۶) طریقۂ کارروائی (۷) ذیلی قواعد۔

ذیلی قواعد کے تحت ان امور کا ذکر کیا جاتا ہے جو دستور کی دوسری دفعات کی طرح اہم تو نہیں ہوتے لیکن اُن سے انجمن کی کارروائیوں میں سہولت پیدا ہوتی ہے۔

عہدہ داران و اراکین

ہر رکن انجمن کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ دستور کی پابندی کرتے ہوئے انجمن کے کسی عہدے کے لئے امیدوار کی حیثیت سے پیش ہو۔ جس کا رائے دہی کے ذریعہ انتخاب کیا جائے گا۔ آج کل انجمنوں میں خفیہ رائے دہی کا طریقہ بہت عام ہے۔

مجلس انتظامی میں دو قسم کے اراکین شامل ہوتے ہیں:- (۱) عہدہ داران، اور (۲) اراکین، ان کی تعداد کا تعین ہر انجمن میں ضرورت کے لحاظ سے کیا جاتا ہے۔ ہر انجمن میں علی العموم حسب ذیل عہدہ دار ہوتے ہیں:-

(۱) صدر (۲) نائب صدر (۳) منتظم (۴) خازن (۵) کتب خانہ دار وغیرہ

ان عہدہ داروں کا ہاتھ بٹانے کے لئے نائبین کے انتخاب کا انھیں حق دیا جاتا ہے۔ لیکن اس قاعدے سے نائب صدر مستثنیٰ ہوتا ہے۔

صدر نشین

انجمن کی کامیابی کا تمام تر دار و مدار ایک ہوشیار اور تجربہ کار صدر پر ہوتا ہے۔ صدر ایسی قابلیت کا مالک ہو کہ وہ جماعت کی ہر معاملے میں رہبری کر سکے۔ صدر کو دوسرے اراکین انجمن کی نسبت قواعد و ضوابط کا زیادہ علم ہونا چاہیے تاکہ وہ انجمن کی کارروائیاں صحیح طریقے پر انجام دے سکے۔

غیر معمولی جلسوں کی صدارت کے لئے تحریک ضروری ہے، لیکن انجمن کے صدر کے لئے کسی تحریک صدارت کی ضرورت نہیں ہے۔ تحریک کے حسب ذیل اجزاء ہوتے ہیں۔

(۱) صدر کا تعارف اور جلسے کی صدارت کے لئے اس کی موزونیت۔

(۲) درخواستِ صدارت۔

تحریک کے بعد صدارت کے لئے تائید بھی ضروری ہے۔ تائید کے بھی بالعموم وہی اجزاء ہوتے ہیں جو تحریک صدارت کے بتائے گئے ہیں۔

صدر نشین صدارت کی کرسی پر بیٹھنے سے پہلے محرک و موید کا مختصر الفاظ میں شکریہ ادا کرے گا اور جلسے کے انعقاد سے متعلق چند جملے کہنے کے بعد جلسہ کی کارروائی کا آغاز کرے گا۔

روئداد:۔ معتمد کا فرض ہے کہ ہر جلسے کی باضابطہ روئداد رکھے اور گزشتہ

جلسے کی روئداد کو اسی نوعیت کے دوسرے جلسے میں پڑھے۔ صدر کے لئے ضروری ہے کہ جب روئداد ختم ہو تو حاضرین سے دریافت کرے کہ اس کا کوئی جز قابلِ اعتراض تو نہیں ہے اور اس کے بعد اپنے دستخط کر کے اس کی توثیق کر دے۔

روئیداد بہت ہی سادھی اور سلیس زبان میں لکھی جائے، استعارہ اور تشبیہ کا کہیں بھولے سے بھی استعمال نہ کریں۔ روئداد میں مختصراً تمام جلسے کی کارروائی کا ذکر کیا جائے۔ جلسے کی تاریخ، وقت، مقام اور صدارت کا ذکر ضروری ہے اور یہ لکھنا بھی نامناسب نہیں ہے کہ کتنی دیر تک جلسہ ہوتا رہا۔

روئداد کے حسب ذیل عنوانات ہوتے ہیں:۔

(۱) صدارت (۲) تاریخ (۳) وقت (۴) مقام (۵) جلسے کی نوعیت (اگر تقریری یا مباحثی جلسہ ہو تو اس کا عنوان) (۶) رائے شماری۔

روئداد ختم ہونے پر محرک سے تقریر شروع کرنے کی درخواست کرے اور کسی خاص تقریر کے موقع پر مناسب الفاظ میں مقرر کا تعارف بھی ضروری ہے۔ تعارف کے لئے حسب ذیل باتیں بیان کی جائیں۔

(۱) مقرر کا نام۔

(۲) مقرر کی حیثیت۔

(۳) تقریر کے عنوان پر چند تمہیدی جملے۔

مقرر کا سامعین سے تعارف کرانا اس لئے ضروری ہے کہ سامعین پوری طرح مقرر سے واقف ہو جائیں اور اس طرح اُن کی توجہ بھی تقریر پر زیادہ مبذول کرائی جا سکتی ہے۔ مقرر کے تعارف میں صدر نشین کو اپنی اہمیت واضح نہیں کرنا چاہیے

اس سے نہ صرف صدر نشین کے متعلق سامعین کے خیالات خراب ہو جاتے ہیں بلکہ مقرر کی حیثیت بھی اس سے متاثر ہوتی ہے۔

صدر نشین کی بعض بہت ہی معمولی لغزشیں بھی مقرر کے لئے پریشان کن ثابت ہوتی ہیں۔ بعض لوگ مقرر کا تعارف کراتے ہوئے نام کے تلفظ میں فاش غلطی کرتے ہیں جس سے حاضرین بے اختیار قہقہے لگانے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ خاص کر غیر زبانوں اور ملکوں کے ناموں میں اس قسم کی غلطی کا احتمال رہتا ہے۔

مقرر کو یاد رکھنا چاہیے کہ اس کا خطاب صرف صدر نشین سے ہونا چاہیے۔ اکثر مقررین صدر کے ساتھ سامعین کو بھی مخاطب کرتے ہیں۔ اس سے اُن کی لاعلمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مخاطبت کے لئے جناب صدر بہت کافی ہے۔

اسی طرح سامعین کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ راست مقرر سے کوئی بات دریافت کریں۔ اگر مقرر سے کوئی بات دریافت کرنی ہو یا اس کی تقریر کا کوئی جزو قابل اعتراض ہو تو ضروری ہے کہ پہلے اشارۂ توجہ (نقطۂ اعتراض اور استفسار) کے ذریعہ صدر کو مخاطب کریں۔ ایسی صورت میں مقرر فوراً اپنی تقریر روک دے ورنہ صدر نشین مقرر کو اس کی طرف توجہ دلائے اور اعتراض سنے۔ اگر اعتراض واجبی ہو تو مقرر کو اس کا جواب دینے کے لئے کہا جائے۔

صدر نشین کے اختیارات بہت غیر معمولی ہوتے ہیں اگر کسی رکن جلسہ کی کوئی بات قابلِ اعتراض ہو تو صدر نشین اس کا مجاز ہوتا ہے کہ اسے اپنے الفاظ واپس لینے کا حکم دے اور بصورت دیگر اُسے مجبور کر سکتا ہے کہ وہ جلسہ گاہ چھوڑ دے۔ مباحثے کے ختم پر دعائے شاری ہوتی ہے اور اس کے بعد صدارتی تقریر کی جاتی ہے۔

صدارتی تقریر میں حسب ذیل باتیں بیان کی جائیں۔

(۱) تقریروں پر تبصرہ (۲) رائے شماری کے نتیجے پر تبصرہ (۳) موضوع سے متعلق اپنا نقطۂ نظر۔

تقریروں پر تبصرہ کرنے میں ہمیشہ متانت اور سنجیدگی کو ملحوظ رکھا جائے اور تبصرہ، تنقید، مقررین کے لئے حوصلہ شکن نہ ہو بلکہ اس میں ایسی جاذبیت ہو کہ مقررین اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ بعض صدر نشینوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے کو دوسرے مقرروں سے بہت کچھ بڑھ چڑھ کر ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سے مقرروں کی ہمتیں پست ہو جاتی ہیں۔

تحریک

تحریکیں کئی قسم کی ہوتی ہیں۔ ان میں سے بعض تحریکوں کے ساتھ ان کی تائید ضروری ہے اور اس کے بغیر وہ منظور نہیں ہو سکتیں لیکن بعض تحریکیں ایسی ہیں جن کی منظوری کے لئے ضروری نہیں کہ تائید بھی کی جائے۔ بلکہ فوراً رائے شماری کے ذریعہ اس کا تصفیہ کیا جا سکتا ہے۔

تحریک اگر کوئی جز تشنہ رہ جائے یا بدل دینے کے قابل ہو تو اس میں ترمیم کی جاتی ہے اور ترمیم اگر منظور ہو جائے تو اس کے ساتھ پہلی تحریک کو دوبارہ منظوری کے لئے ایوان میں پیش کیا جائے۔

اگر کسی تحریک پر بحث کرنے کے لئے وقت ناکافی ہو تو کوئی بھی اس تحریک کو ملتوی کرنے کے لئے تحریک پیش کر سکتا ہے۔ اس تحریک التوا پر علیحدہ بحث کی جائے اور اگر اس کو اکثریت منظور کرے تو اس کے ساتھ ہی دوبارہ اس تحریک کو

پیش کرنے کے لئے تاریخ اور وقت کا بھی تعین کیا جاتا ہے۔

بعض اوقات انجمن کے قواعد وضوابط میں کسی قدر تبدیلی کرنے کے لئے ایسی تحریکیں بھی پیش کی جاتی ہیں جن کی پابندی ہمیشہ ضروری نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف موقتی ہوتی ہے اور مدت گزر جانے کے بعد وہ خود بخود ساقط ہو جاتی ہے۔ لیکن ایسی تحریکوں کو پیش کرتے وقت انجمن کے بنیادی اصولوں کو کبھی متاثر ہونے نہیں دیتے۔

اگر محرک اپنی تحریک واپس لینا چاہے تو ضروری ہے کہ وہ صدر نشین کی تشریح و توضیح سے پہلے ہی حاصل کرے۔ لیکن اگر صدر نشین نے تحریک کی وضاحت کی ہو تو اس کی واپسی کے لئے حاضرین کی رائیں لی جانی چاہئیں۔ اگر اکثریت اس کو منظور کرے تو تحریک واپس لی جا سکتی ہے۔

مجالسِ خصوصی

ہر انجمن کے لئے اپنے کاموں میں سہولت پیدا کرنے کی غرض سے بعض خصوصی مجلسیں (کمیٹیاں) مقرر کرنی پڑتی ہیں۔ اس قبیل کی مجلسوں میں مجلس عاملہ کے اراکین کے علاوہ بعض اوقات دوسرے واقف کار عام اراکین بھی شریک کرلئے جاتے ہیں۔ ان مجلسوں میں، مجلس موضوعات، مجلس قائمہ، اور مجلس انتخابات وغیرہ شامل ہیں۔ ان میں ہر ایک کے انعقاد کا مقصد جداگانہ ہوتا ہے جس کا ان کے ناموں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

حسب ذیل انگریزی اور اُردو کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے

Ease in Speech By Margret

The Speaker and Debater

Published by The English Press

Science and Art of Speech and Gestue

By Rose Miller

Howto Preside at Meetings

By S. Currie, M. A.

۱۔ روح الاجتماع ڈاکٹر لبان مترجمہ مولانا یونس انصاری فرنگی محلی

۲۔ فلسفۂ اجتماع از عبدالماجد دریابادی

۳۔ سرسید کے لکچرز (مقالہ) از رشید الحسن صاحب ایم۔اے

اشاریہ

الف

ابن سعود ۹۲
ابوالکلام آزاد ۹۷، ۱۰۰
اشوک ۱۱
اکبر حیدری، سر ۴۹
البلاغ ۹۷
الگزینڈر راجر ۴۹
الہلال ۹۷

ب

بشیرالدین احمد ۸۴
برک ۹۳
بہادر یار جنگ ۷۸، ۹۹، ۱۰۰
بھگوان داس ۱۳

پ

پریکلیز ۱۰، ۶۱ تا ۶۳

ت

توسی ڈائڈیز ۶۲
تہذیب الاخلاق ۷۲

ج

جارج ۹۳
جواہرلال نہرو ۹۱
جیمس ۲۲

چ

چیت رائے ۱۳

ح

حالی ۷۲، ۷۵، ۷۶
حیات جاوید ۷۵

د

دیماستھنز ۱۰
دھیان سنگھ ۷۶

ذ

ذکاءاللہ ۷۲، ۸۳

ر

رشیدالحسن ۱۳

س

سالار جنگ ۴۹

سرسید ۱۳-۵۲-۷۲ تا ۷۶، ۸۰، ۷۹، ۸۱، ۸۳ تا ۸۵

سسرو ۱۰، ۸۷

ش

شبلی ۷۲

شوکت علی ۹۰

ض

ضیاء الدین ڈاکٹر ۴۹

ع

عبدالعزیز، آزیبل ۴۸

عزیز مرزا ۸۶ تا ۸۸، ۸۹

عطاء اللہ شاہ بخاری ۹۵، ۱۰۰

ف

فلسفۂ اجتماعیت ۲۲

ک

کامریڈ ۹۱

کونٹیلین ۱۰، ۸۷

گ

گریہم ۷۶

گلیڈسٹین ۷۶

م

محسن الملک ۷۲، ۷۵

محمد علی - مولانا ۹۰ تا ۹۵، ۱۰۰

مسعود جنگ - سر راس مسعود ۵۶

مصطفیٰ کمال ۴۳

مکالے ۹۳

ن

نادر شاہ ۲۳

نپولین ۲۳، ۲۴، ۹۳

نذیر احمد ۷۶، ۸۱، ۸۳، ۸۴

و

وقار الملک ۷۲، ۷۸

ولی اورنگ آبادی ۴۵

ھ

ہٹلر ۱۷